اسم اعظم

روحانی کلاس کی ابتدائی کتاب

تصنیف: خواجہ شمس الدین عظیمی

ناشر..................مکتبہ عظیمیہ لاہور

قیمت

کمپیوٹر کمپوزنگ ....علوی پروسس (منور فیروز)

مکتبہ عظیمیہ ٥ اردو بازار، لاہور

انتساب

روحانی

طالب علموں

کے نام

ترتیب وپیشکش

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے علم حاصل کرو خواہ تمہیں چین میں ملے۔اس زمانے میں چین ایک بڑا متمدن اور ترقی یافتہ ملک تھا اور علم و دانش کا ایک بڑا مرکز تھا۔ 1987ء میں مراقبہ ہال (جامعہ عظیمیہ) کا قیام عمل میں آیا۔مرشد کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی نے افتتاحی تقریر میں فرمایا تھا انشاءاللہ یہاں روحانی کلاسز کا اجراء ہوگا اور یہاں روحانی علم کی شمع روشن ہوگئی گفتہ وگفتہ اللہ بود کے مصداق مراقبہ ہال لاہور میں روحانی کلاسز شروع ہوگئیں ہیں کورس کی پہلی کتاب مرشد کریم کے لکھے ہوئے کتابچوں سے ترتیب دی گئی ہے۔ روحانی کلاس کی پہلی کتاب میں ابتدائی نوعیت کے روحانی سوال و جواب لکھے گئے ہیں مجھے یقین ہے کہ اگر طالبات اور طلباء ذوق وشوق سے اس کتاب کو استاد کی نگرانی میں پڑھیں اور تھیوری کے ساتھ ساتھ پریکٹیکل مراقبہ بھی کریں تو ان کے علم (Knowledge) میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔

تمام دوستوں، طالبات اور طلباء سے درخواست ہے کہ وہ میرے لئے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے سلسلہ عالیہ عظیمیہ کی خدمت اور مرشد کریم کی صحبت عطا فرمائے اور میرے علم میں اضافہ ہو۔(آمین)

کتاب کو نئے سرے سے ترتیب دیا گیا ہے اور اس میں اضافہ بھی کیا گیا ہے۔مرشد کریم کے باقی کتابچوں کو کتابی شکل دے دی گئی ہے اور انشاءاللہ چار جلدیں تیار ہوچکی ہیں۔امید ہے کہ آپ کو میری یہ کاوش پسند آئے گی۔اللہ تعالیٰ آپ کا حامی وناصر ہو۔

میاں مشتاق احمد عظیمی

روحانی فرزند

9-7-95

6-62001

حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی

مراقبہ ہال 158 مین بازار مزنگ لاہور۔ 7243541

فہرست

ٹائٹل

www.islamiurdubook.blogspot.com

نظریہ رنگ و روشنی

☆............... انسان اب تک رنگ کی تقریباً ساٹھ قسمیں معلوم کی ہیں، ان میں بہت تیز نگاہ والے ہی امتیاز کر سکتے ہیں، جس چیز کو اس کی نگاہ محسوس کرتی ہے، اس کو رنگ، روشنی، جواہرات اور آخر میں کم و بیش پانی سے تعبیر کرتا ہے۔

اس بات سے قطع نظر کہ آسمانی رنگ کیا ہے؟ کس طرح بنا ہے؟ آیا وہ صرف خیالی ہے یا کوئی حقیقت ہے۔ بہرکیف انسان کی نگاہ اسے محسوس کرتی ہے اور اسے جو نام دیتی ہے وہ آسمانی ہے۔

جب فضا گرد و غبار سے بالکل پاک ہوتی ہے تو آسمانی رنگ کی شعاعیں اپنے مقام کے اعتبار سے رنگ بدلتی ہیں۔ مقام سے مراد وہ فضا ہے جس کو انسان بلندی، پستی، وسعت اور زمین سے قربت یا دوری کا نام دیتا ہے۔ یہی حالات آسمانی رنگ کو ہلکا، گہرا اور زیادہ گہرا، زیادہ ہلکا یہاں تک کہ مختلف رنگوں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

حدِ نگاہ سے زمین کی طرف آئیے تو آپ کو نیلے رنگ کی لاتعداد رنگین شعاعیں ملیں گی، یہاں اس لفظ رنگ کو "قسم" کہا جا سکتا ہے۔ دراصل قسم ہی وہ چیز ہے جو ہماری نگاہوں میں رنگ کہلاتی ہے، یعنی رنگ کی قسمیں، صرف رنگ نہیں بلکہ رنگ کے ساتھ فضا میں اور بہت سی چیزیں ملی ہوتی ہیں وہ اس میں تبدیلی پیدا کر دیتی ہیں، اس چیز کو "قسم" کے نام سے بیان کرنا ہمارا منشاء ہے۔

رنگ کا جو منظر ہمیں نظر آتا ہے اس میں روشنی آکسیجن گیس، نائیٹروجن گیس اور قدرے دیگر گیسیں (GASES) بھی شامل ہوتی ہیں ان گیسوں کے علاوہ کچھ سائے (SHADES) بھی ہوتے ہیں جو ہلکے ہوتے ہیں یا دبیز، کچھ اور بھی اجزاء اسی طرح آسمانی رنگ میں شامل ہو جاتے ہیں ان ہی اجزاء کو ہم مختلف قسمیں کہتے ہیں یا مختلف رنگوں کا نام دیتے ہیں لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ان میں ہلکے اور دبیز سایوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

جس فضا سے ہمیں رنگ کا فرق نظر آتا ہے اس فضا میں نگاہ اور حدِ نگاہ کے درمیان، باوجود مطلع صاف ہونے کے بہت کچھ موجود ہوتا ہے۔

فوٹان اور الیکٹران

اول ہم ان روشنیوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو خاص طور پر آسمانی رنگ پر اثر انداز ہوتی ہیں۔
روشنیوں کا سرچشمہ کیا ہے اس کا بالکل صحیح علم انسان کو نہیں ہے قوسِ قزح کا جو فاصلہ بیان کیا جاتا ہے وہ زمین سے تقریباً نو(۹) کروڑ میل ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو رنگ ہمیں اتنے قریب نظر آتے ہیں وہ نو کروڑ میل کے فاصلہ پر واقع ہیں۔ اب یہ سمجھنا مشکل کام ہے کہ سورج کے اور زمین کے درمیان علاوہ کرنوں کے اور کیا کیا چیزیں موجود ہیں جو فضا میں تحلیل ہوتی رہتی ہیں۔

جو کرنیں سورج سے ہم تک منتقل ہوتی رہتی ہیں ان کا چھوٹے سے چھوٹا جزو فوٹان (PHOTON) کہلاتا ہے اور اس فوٹان کا ایک وصف یہ ہے کہ اس میں اسپیس (SPACE) نہیں ہوتا۔ اسپیس سے مراد ڈائی مینشن (DIMENSION) ''ابعاد'' ہیں یعنی اس میں لمبائی چوڑائی موٹائی نہیں ہے اس لئے جب یہ کرنوں کی شکل میں پھیلتے ہیں تو نہ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں، نہ ایک دوسرے کی جگہ لیتے ہیں، بالفاظ دیگر یہ جگہ نہیں روکتے، اس وقت تک جب تک کہ دوسرے رنگ سے نہ ٹکرائیں۔ یہاں دوسرے رنگ کو پھر سمجھئے۔

فضا میں جس قدر عناصر موجود ہیں ان میں سے کسی عنصر سے فوٹان کا ٹکراؤ ہی اسے اسپیس دیتا ہے۔
دراصل یہ فضا کیا ہے؟ رنگوں کی تقسیم ہے۔ رنگوں کی تقسیم جس طرح ہوتی ہے وہ اکیلے فوٹان کی رو سے نہیں ہوتی بلکہ ان حلقوں سے ہوتی ہے جو فوٹانوں سے بنتے ہیں۔ جب فوٹانوں کا ان حلقوں سے ٹکراؤ ہوتا ہے تو اسپیس یا رنگ وغیرہ کئی چیزیں بن جاتی ہیں۔

کہکشانی نظام اور دو کھرب سورج

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کرنوں میں یہ حلقے کیسے پڑے؟ ہمیں یہ تو علم ہے کہ ہمارے کہکشانی نظام میں بہت سے اسٹار یعنی سورج ہیں، وہ کہیں نہ کہیں سے روشنی لاتے ہیں، ان کا درمیانی فاصلہ کم سے کم پانچ نوری سال بتایا جاتا ہے جہاں ان کی روشنیاں آپس میں ٹکراتی ہیں، وہ روشنیاں چونکہ قسموں پر مشتمل ہیں اس لئے حلقے بنا دیتی ہیں جیسے ہماری زمین یا اور سیارے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سورج سے یا کسی اور اسٹار سے جن کی تعداد ہمارے کہکشانی نظام میں دو کھرب بتائی جاتی ہے، ان کی روشنیاں سنکھوں کی تعداد پر مشتمل ہیں اور جہاں ان کا ٹکراؤ ہوتا ہے وہیں ایک حلقہ بن جاتا ہے جسے سیارہ کہتے ہیں۔

اب فوٹان میں اسپیس پیدا ہو جاتا ہے اور اسپیس کے چھوٹے سے چھوٹے ذرے کو الیکٹران کہتے ہیں جہاں فوٹان اور الیکٹران دونوں ٹکراتے ہیں وہیں سے نگاہ رنگ دیکھنا شروع کر دیتی ہے، رنگ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ نگاہ کیا ہے، کیوں ہے، نگاہ کی تیزی کیا ہے اور کیوں ہے اس سے ہمیں بحث نہیں۔

دو پیروں اور چار پیروں سے چلنے والے جانور

جانور دو ہیں ۔ایک جانور پیروں سے چلنے والا ہے اور دوسرا دو پیروں سے چلنے والا ہے ۔اڑنے والا جانور اور تیرنے والا جانور بھی چار پیروں سے چلنے والے جانوروں میں شامل ہے ۔اس لئے کہ وہ پَر بھی استعمال کرتا ہے اور پیر بھی ۔نیز اس کے اڑنے کی صورت بھی وہی ہوتی ہے جو چار پیروں سے چلنے والے جانور کی ہوتی ہے ۔دو پیروں سے چلنے والا جانور آدمی ہے ۔

چار پیروں سے چلنے والا جانور، اڑنے والا جانور، تیرنے والا جانور آسمانی رنگ کو تمام جسم میں یکساں قبول کرتے ہیں اسی وجہ سے عام طور پر ان میں جبلت کام کرتی ہے، فکر کام نہیں کرتی یا زیادہ سے زیادہ انہیں سکھایا جاتا ہے لیکن وہ بھی فکر کے دائرے میں نہیں آتا ۔جن چیزوں کی انہیں اپنی زندگی میں ضرورت پڑتی ہے صرف ان چیزوں کو قبول کرتے ہیں، ان میں زیادہ غیر ضروری چیزوں سے یہ واسطہ نہیں رکھتے، جن چیزوں کی انہیں ضرورت ہوتی ہے ان کا تعلق زیادہ تر آسمانی رنگ کی لہروں سے ہوتا ہے ۔

دو پیروں سے چلنے والا جانور یعنی آدمی سب سے پہلے آسمانی رنگ کا مخلوط یعنی بہت سے ملے ہوئے رنگوں کو اپنے بالوں اور سر میں قبول کرتا ہے اور اس رنگ کا مخلوط پیوست ہوتا رہتا ہے ۔یہاں تک کہ جتنے خیالات، کیفیات اور محسوسات وغیرہ اس رنگ کے مخلوط سے اس کے دماغ کو متاثر کرتے ہیں وہ اتنا ہی متاثر ہوتا ہے ۔

دماغ میں کھربوں خانے ہوتے ہیں اور ان میں سے برقی رو گزرتی رہتی ہے، اسی برقی رو کے ذریعے خیالات، شعور اور تحت الشعور سے گزرتے رہتے ہیں اور اس سے بہت زیادہ لاشعور میں ۔

دماغ کا ایک خانہ وہ ہے جس میں برقی رو فوٹو لیتی رہتی ہے اور تقسیم کرتی رہتی ہے، یہ فوٹو بہت ہی زیادہ تاریک ہوتا ہے یا بہت ہی زیادہ چمکدار ۔

ایک دوسرا خانہ ہے جس میں کچھ اہم باتیں ہرتی ہیں لیکن وہ اتنی اہم نہیں ہوتیں کہ سالہا سال گزرنے کے بعد بھی یاد آجائیں، ایک تیسرا خانہ اس سے زیادہ اہم باتوں کو جذب کر لیتا ہے، وہ بشرط موقع کبھی کبھی یاد آجاتی ہیں ۔ایک چوتھا خانہ معمولات (ROUTINE CHORES) کا جس کے ذریعہ آدمی عمل کرتا ہے لیکن اس میں ارادہ شامل نہیں ہوتا، پانچواں خانہ وہ ہے جس میں گزری ہوئی باتیں اچانک یاد آجاتی ہیں جن کا زندگی کے آپس کے تار و پود سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔منشاء یہ ہے کہ ایک بات یاد آئی، دوسری بات ساتھ ہی ایسی یاد آئی جس سے پہلے بات کا کبھی کوئی تعلق نہیں تھا، ایک چھٹا خانہ ایسا ہے جس کی یا تو کوئی بات یاد نہیں آتی اور اگر یاد آتی ہے تو فوراً اس کے ساتھ ہی عمل ہوتا ہے ۔اس کی مثال یہ ہے ۔کسی پرندے کا

خیال آیا، خیال آتے ہی عملاً وہ پرندہ سامنے ہے، ساتواں خانہ اور ہے جس کو عام اصطلاح میں حافظہ (MEMORY) کہتے ہیں۔

دماغ میں مخلوط آسانی رنگ آنے سے اور پیوست ہونے سے خیالات، کیفیات، محسوسات وغیرہ برابر بدلتے رہتے ہیں، اس کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ اس رنگ کے سائے ہلکے بھاری یعنی طرح طرح کے اپنا اثر کم وبیش پیدا کرتے ہیں اور فوراً اپنی جگہ چھوڑ دیتے ہیں تا کہ دوسرے سائے ان کی جگہ لے سکیں، بہت سے سائے جنہوں نے جگہ چھوڑ دی ہے محسوسات بن جاتے ہیں اس لئے کہ وہ گہرے ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے خیالات کی صورتیں منتشر ہو جاتی ہیں۔ رفتہ رفتہ انسان ان خیالات کو ملانا سیکھ لیتا ہے ان میں سے جن خیالات کو بالکل کاٹ دیتا ہے وہ حذف ہو جاتے ہیں اور جو جذب کر لیتا ہے وہ عمل بن جاتے ہیں، یہ سائے اسی طرح کام کرتے رہتے ہیں، انہی سایوں کے ذریعہ انسان رنج وراحت حاصل کرتا ہے۔ کبھی وہ رنجیدہ اور بہت رنجیدہ ہو جاتا ہے، کبھی وہ خوش اور بہت خوش ہو جاتا ہے۔ یہ سائے جس قدر جسم سے خارج ہو سکتے ہیں ہو جاتے ہیں لیکن جتنے جسم کے اندر پیوست ہو جاتے ہیں وہ اعصابی نظام بن جاتے ہیں۔

آدمی دو پیر سے چلتا ہے اس لئے سب سے پہلے ان سایوں کا اثر اس کا دماغ قبول کرتا ہے، دماغ کی چند حرکات معین ہیں جن سے وہ اعصابی نظام میں کام لیتا ہے۔ سر کا پچھلا حصہ یعنی ام الدماغ اور حرام مغز اس اعصابی نظام میں خاص کام کرتا ہے، رنج وخوشی دونوں سے اعصابی نظام متاثر ہوتا ہے، رنج وخوشی دراصل بجلی کی ایک رو ہے جس دماغ سے داخل ہو کر تمام اعصاب میں سما جاتی ہے۔ یہ لہریں دو پیروں سے چلنے والے جانور کے دماغ میں داخل ہوتی ہیں۔ ان لہروں کا وزن، تجزیہ، فضا، ہر جگہ بالکل یکساں نہیں ہوتا بلکہ جگہ جگہ تقسیم ہوتا ہے اور اس تقسیم کار میں وہ لہروں کے کچھ سائے زیادہ جذب کرتا ہے اور کچھ سائے کم انسان کے دماغ میں لاشمار خلیے (CELLS) بھی کام کرتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ان لاشمار خلیوں میں سائے کی لہریں جو فضا سے منتقل ہیں وہ اپنے اثرات کو برقرار رکھیں، کبھی ان کے اثرات بہت کم رہ جاتے ہیں، کبھی ان کے اثرات بالکل نہیں رہتے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ یہ تمام خلئے جو دماغ سے تعلق رکھتے ہیں کسی وقت خالی نہیں رہتے۔ کبھی ان کا رخ ہوا کی طرف زیادہ ہوتا ہے، کبھی پانی کی طرف، کبھی غذا کی طرف اور کبھی تنہا روشنی کی طرف، اسی روشنی سے رنگ اور رنگوں کی ملاوٹی شکلیں منتقل ہیں اور خرچ ہوتی رہتی ہیں۔

چہرہ میں فلم

اگر انسان دماغ سے کام لے تو چہرہ پر طرح طرح کے رنگ نظر آتے ہیں۔ان رنگوں میں سب سے زیادہ نمایاں آنکھوں کا رنگ اور حواس کی رَو ہوتی ہے۔اگرچہ آنکھیں بھی حواس میں شامل ہیں لیکن یہ ان چیزوں کا جو باہر سے دیکھتی ہیں زیادہ اثر قبول کرتی ہیں، بہت سے باہر کے عکس آنکھوں کے ذریعہ اندرونی دماغ کو متاثر کرتے ہیں۔اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ حواس تازہ ہو جاتے ہیں یا افسردہ ہو جاتے ہیں۔کمزور ہو جاتے یا طاقتور۔انہی باتوں پر دماغ کا انحصار ہے۔رفتہ رفتہ یہی دماغ کا کام اعصاب میں سرایت کر جاتا ہے جو صحیح بھی کام کرتا ہے اور غلط بھی۔

دماغی لہروں سے چہرہ پر اتنے زیادہ اثرات آجاتے ہیں کہ ان سب کا پڑھنا مشکل ہے پھر بھی ایک فلم چہرہ میں چلتی رہتی ہے جو اعصاب میں منتقل ہونے والے تاثرات کا پتہ دیتی ہے۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ رنگوں کی تعداد بہت ہے اور ان کی افادیت بہت زیادہ ہے۔

آسمانی رنگ کیا ہے؟

آسمانی رنگ فی الحقیقت کوئی رنگ نہیں بلکہ وہ ان کرنوں کا مجموعہ ہے جو ستاروں سے آتی ہیں ۔جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ کہیں بھی ان ستاروں کا فاصلہ پانچ نوری سالوں سے کم نہیں ہے ۔ (ایک کرن ایک لاکھ چھیاسی ہزار دو سو بیاسی میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہے)۔اسی طرح نوری سال کا حساب لگایا جا سکتا ہے۔

ہر ستارہ کی روشنی سفر کرتی ہے اور سفر کرنے کے دوران ایک دوسرے سے ٹکراتی ہے،ان میں ایک کرن کا کیا نام رکھا جائے یہ انسان کے بس کی بات نہیں ہے، نہ انسان کرن کے رنگ کو آنکھوں میں جذب کر سکتا ہے ۔ یہ کرنیں مل جل کے جو رنگ بناتی ہیں، وہ تاریک ہوتا ہے اور اس تاریکی کو نگاہ آسمانی محسوس کرتی ہے، انسان کے سر میں اس کیسرایت کر جاتی ہے نتیجے میں وہ لاتعداد خلئے جو انسان کے سر میں موجود ہیں اس فضا سے معمور ہو جاتے ہیں اور یہاں تک معمور رہوتے ہیں کہ ان خلیوں میں مخصوص کیفیات کے علاوہ کوئی کیفیت سما نہیں سکتی، یا تو ہر خلیے کی ایک کیفیت ہوتی ہے یا کئی خلیوں میں مماثلت پائی جاتی ہے اور ان کی وجہ سے ایک دوسرے کی کیفیات شامل ہو جاتی ہیں لیکن یہ اس طرح کی شمولیت نہیں ہوتی کہ بالکل مدغم ہو جائے بلکہ اپنے اپنے اثرات لے کر خلط ملط ہو جاتی ہے اور اس طرح دماغ کے لاتعداد خلیے ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتے ہیں اور یہاں تک پیوست ہوتے ہیں کہ ہم کسی خلیے کا عمل یا ردعمل ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے بلکہ وہ مل جل کر وہم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں ۔اگر یہ کہا جائے کہ انسان تو ہماتی جانور ہے تو بے جا نہیں ہو گا،خلیوں کی یہ فضا تو ہمات کہلا سکتی ہے یا خیالات یا محسوسات یہ تو ہماتی فضا دماغی ریشوں میں سرایت کر جاتی ہے، ریشے جو باریک ترین ہیں ۔

خون کی گردش رفتار ان میں تیز تر ہوتی ہے، اسی گردش رفتار کا نام انسان ہے،خون کی نوعیت اب تک جو کچھ سمجھی گئی ہے فی الواقع اس سے کافی حد تک مختلف ہے ۔

آسمانی فضا سے جو تاثرات دماغ کے اوپر مرتب ہوتے ہیں، وہ ایک بہاؤ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور حقیقت میں ان کو تو ہمات یا خیالات کے سوا اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا، جب آسمانی رنگ کی فضا خون کی رو بن جاتی ہے تو اس کے اندر وہ حلقے کام کرتے ہیں جو دوسرے ستاروں سے آئے ہیں وہ حلقے چھوٹے سے چھوٹے ہوتے ہیں ۔اس قدر چھوٹے کہ دوربین بھی نہیں دیکھ سکتی لیکن ان کے تاثرات عمل کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، انسان کے اعصاب میں وہی حرکات بنتے ہیں اور انہی کی زیادتی یا کمی اعصابی نظام میں خلل پیدا کرتی ہے۔

رنگوں کا فرق

رنگوں کا فرق بھی یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ ہلکا آسمانی رنگ بہت ہی کمزور قسم کا وہم پیدا کرتا ہے، یہ وہم دماغی فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے اس طرح کہ ایک ایک خلیے میں درجنوں آسمانی رنگ کے پرتو ہوتے ہیں یہ پرتو الگ الگ تاثرات رکھتے ہیں، وہم کی پہلی رو خاص کر بہت ہی کمزور ہوتی ہے، جب یہ رو دو یا دو سے زیادہ چھ تک ہو جاتی ہیں، اس وقت ذہن اپنے اندر وہم کو محسوس کرنے لگتا ہے یہ وہم اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ اگر جنبش نہ کرے اور ایک جگہ مرکوز ہو جائے تو آدمی نہایت تندرست رہتا ہے اسے کوئی اعصابی کمزوری نہیں ہوتی بلکہ اس کے اعصاب صحیح سمت میں کام کرتے ہیں، اس رو کا انداز بہت ہی شاذ ہوتا ہے، اگر یہ رو کسی ایک ذرہ پر یا کسی ایک سمت میں یا کسی ایک رخ پر مرکوز ہو جائے اور تھوڑی دیر بھی مرکوز رہے تو دور دراز تک اپنے اثرات مرتب کرتی ہے۔ انسان کو اس رو کے ذریعہ متاثر کیا جا سکتا ہے۔ ٹیلی پیتھی کا اصل اصول یہی ہے یہ وہم ان چیزوں کو بھی متاثر کرتا ہے جو ذی روح نہیں سمجھی جاتیں۔

سب سے پہلا اثر اس کا دماغی اعصاب پر ہوتا ہے، یہاں تک کہ دماغ کے لاکھوں خلیے اس کی چوٹ سے فنا ہو جاتے ہیں۔ اب دماغی خلیے جو باقی رہتے ہیں وہ ام الدماغ کے ذریعہ اسپائنل کورڈ (SPINAL CORD) میں اپنا تصرف لے جاتے ہیں، یہی وہ تصرف ہے جو باریک ترین ریشوں میں تقسیم ہوتا ہے، اس تصرف کے پھیلنے سے حواس بنتے ہیں، ان میں سب سے پہلی حس نگاہ کی ہے۔ آنکھ کی پتلی پر جب کوئی عکس پڑتا ہے تو وہ اعصاب کے باریک ترین ریشوں میں ایک سنسناہٹ پیدا کر دیتا ہے۔ یہ ایک مستقل برقی رو ہوتی ہے اگر اس کا رخ صحیح ہے تو آدمی بالکل صحت مند ہے، اگر اس کا رخ صحیح نہیں ہے تو دماغ کی فضا کا رنگ گہرا ہو جاتا ہے اور گہرا ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ دماغ میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے اور اعصاب اس رنگ کے پریشر کو برداشت نہیں کر سکتے۔ آخر میں یہ رنگ اتنا گہرا ہو جاتا ہے کہ اس میں تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں مثلاً آسمانی رنگ سے نیلا رنگ بن جاتا ہے۔ درمیان میں جو مرحلے پڑتے ہیں وہ بے اثر نہیں ہیں۔ سب سے پہلے مرحلے کے زیر اثر آدمی کچھ وہمی ہو جاتا ہے، اسی طرح یکے بعد دیگرے مرحلے رونما ہوتے ہیں، رنگ گہرا ہوتا جاتا ہے اور وہم کی قوتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ باریک ترین ریشے بھی اس تصرف کا اثر قبول کرتے ہیں۔ اب کیفیت مختلف اعصاب میں مختلف شکلیں پیدا کر دیتی ہے، باریک اعصاب میں بہت ہلکی اور معمولی اور تنومند اعصاب میں مضبوط اور طاقتور اسی طرح یہ مرحلے گہرے نیلے رنگ میں تبدیلیاں شروع کر دیتے ہیں۔

رنگوں کے خواص

اب ہم ہلکے نیلے اور گہرے نیلے رنگ کے خواص بیان کرتے ہیں سب سے پہلے ہلکے نیلے رنگ کا اثر دماغی خلیوں پر پڑتا ہے۔ اگرچہ دماغی خلیوں کا رنگ ہلکا نیلا الگ الگ ہوتا ہے۔ لیکن ان خلیوں کی دیواریں ہلکی اور موٹی ہوتی ہیں۔ پھر ان میں رنگوں کے چھاننے کے اثرات بھی موجود ہیں ایک خلیہ اپنے ہلکے نیلے رنگ کو جب چھانٹا ہے تو اس رنگ میں تبدیلی واقع ہوتی ہے اس طرح لاکھوں خلیے مل کر اپنا تصرف کرتے ہیں۔ تصرف کا مطلب یہ ہے کہ ایک فلسفی ان خلیوں کو اور ان خلیوں کے تمام تصرفات کو ایک ہی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تمام خلیوں کا تصرف یکجا ہو کر ایک تخیل بن جاتا ہے۔ اب تصرف کا اختلاف قسم قسم کے فلسفے تخلیق کرتا ہے اور ان کی تخلیقات یہاں تک ہوتی ہیں کہ وہ اکثر ایک عملی شکل اختیار کر لیتی ہیں پھر اسی علم کے اندر اختلافات پیدا ہونے لگتے ہیں جس سے بحث کی باریکیاں نکل آتی ہیں۔ منشاء اس کے بیان کرنے کا یہ ہے کہ یہ اختلاف ایک دوسرے فلسفہ کا مخالف فلسفہ بن جاتا ہے۔ پہلے دلائل میں معمولی اختلافات ہوتے ہیں۔ پھر یہی معمولی اختلافات بڑھ کر غیر معمولی ہو جاتے ہیں۔ یہ سب اس تصرف کا کرشمہ ہے جو خلیوں کا رنگ بدلنے سے ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ان خلیوں کا رنگ اتنا تبدیل ہو جاتا ہے کہ نگاہ انہیں بالکل سرخ، سبز، زرد وغیرہ رنگوں میں دیکھنے لگتی ہے۔ اس لئے کہ باہر سے جو روشنیاں جاتی ہیں ان میں اسپیس (SPACE) نہیں ہوتا بلکہ خلیوں کے تصرف سے اسپیس بنتا ہے۔ خلیوں کا تصرف جب اسپیس بناتا ہے تو آنکھوں کے ذریعہ باہر سے جانے والی کرنوں کو الٹ پلٹ کر دیتا ہے نتیجہ میں رنگوں کی تبدیلیاں یہاں واقع ہوتی ہیں کہ وہ ساٹھ سے زیادہ تک گنے جا سکتے ہیں۔

مثلاً سرخ رنگ کو لیجئے خلیے ان پر اتنا تصرف کرتے ہیں کہ ذرات مل کر آنکھ کے پردوں پر اپنی تیزی پھینکتے ہیں۔ یہ تیزی ایک دوسرے میں غلط ملط ہونے کے بعد سرخ رنگ نظر آنے لگتی ہے۔ اسی طرح خلیوں کا اور تصرف ہوتا ہے مثلاً رنگ تبدل ہو کر سبز ہو جاتے ہیں۔ زرد ہو جاتے ہیں، نارنجی ہو جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ اور کتنے ہی رنگ بدل جاتے ہیں۔ ان رنگوں میں عجیب عجیب تاثرات ہیں۔ یہی رنگ مل کر حواس بناتے ہیں۔ مثلاً سننے کے حواس بہت سارے خلیوں کے عمل سے ترتیب پاتے ہیں۔

ہمارے اردگرد بہت سی آوازیں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کے قطر بہت چھوٹے اور بہت بڑے ہوتے ہیں جن کو انگریزی میں ویولینتھ (Wave Length) کہتے ہیں۔

سائنس دانوں نے اندازہ لگایا ہے کہ چار سو قطر سے نیچے کی آوازیں آدمی نہیں سُن سکتا۔ ایک ہزار چھ سے قطر سے زیادہ اونچی آوازیں بھی آدمی نہیں سُن سکتا۔ چار سو ویولینتھ (Wave Length) سے نیچے

کی آوازیں برقی رو کے ذریعہ سنی جا سکتی ہیں اور ایک ہزار چھ سو ویو لینتھ کی آوازیں بھی بجز برقی رو کے سننا ممکن نہیں۔ یہ ایک قسم کی حس کا عمل ہے جو دماغی خلیے بناتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ سب آسمانی رنگ کے تاثر سے ہوتا ہے۔ یہ رنگ خلیوں میں، خلیوں کی بساط کے مطابق عمل کرتا ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ آسمانی رنگ جو فی الواقع ایک برقی رو ہے، دماغی خلیوں میں آنے کے بعد اسپیس بن جاتا ہے۔ یہ اسپیس بے شمار رنگوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور یہ ہی رنگ آنکھ کے پردہ پر مختلف شکلوں میں نظر آتے ہیں۔

آنکھ کے پردوں پر جو عمل ہوتا ہے وہ خلیے کے اندر بہنے والی رو سے بنتا ہے۔ آنکھ کی حس جس قدر تیز ہوتی ہے۔ اتنا ہی رو میں امتیاز کر سکتی ہے لیکن پھر بھی خلیوں کی رو کا آپس کا تعلق برقرار رہتا ہے۔ اس تعلق کی وجہ سے نگاہ کے پردے متاثر ہوتے ہیں اور ان میں ساٹھ سے زیادہ رنگ تک امتیاز ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد برقی رو سے امداد لینا پڑتی ہے بالکل اس طرح جس طرح کان کی ویو لینتھ کو چار سو سے کم یا سولہ سو سے بڑھا کر کی جاتی ہے۔

ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ کوئی شخص ساٹھ رنگ سے زیادہ قبول نہ کرے اس سے کم پر اکتفا کر لے۔ لیکن یہ بات یہاں بتانا اس لئے ضروری ہے کہ دماغی خلیوں سے اور ان کی برقی رو سے تمام اعصاب کا تعلق ہے۔ تمام اعصاب پر اس کا اثر پڑتا ہے جیسا کہ ہم نے تذکرہ کیا ہے کہ کان کی ویو لینتھ، برقی رو کے ذریعہ چار سو سے کم یا سولہ سو سے زیادہ کی جا سکتی ہے۔ اس کے معنی یہ بھی نکلتے ہیں کہ ہم مستقل برقی رو میں گھرے ہوئے ہیں۔ یہ برقی رو کتنے قسم کی ہے، کتنی تعداد پر مشتمل ہے۔ اس کا شمار کیا ہے، آدمی کسی ذریعہ سے گن نہیں سکتا۔ البتہ یہ برقی رو دماغی خلیوں کے تصرف سے باہر آتی ہے تو طرح طرح کے رنگوں کا جال آنکھوں کے سامنے لاتی ہے، علاوہ آنکھوں کے، چکھنے کی حس، سونگھنے کی حس، سوچنے کی حس، بولنے کی حس اور چھونے کی حس وغیرہ اسی سے مخفی ہے۔

وغیرہ سے مراد یہ نہیں ہے کہ حسیں تعداد میں اتنی ہی ہیں بلکہ یقیناً اور بہت سی حسیں ہیں جو انسان کے علم میں نہیں ہیں۔

اسم اعظم

سوال: کسی مرشد کامل سے بیعت ہونا کسے کہتے ہیں یا اس کا کیا مقصد ہوتا ہے؟

جواب: ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ کسی علم یا فن کے سیکھنے کے لئے استاد کی ضرورت پڑتی ہے جو قدم بہ قدم ہماری رہنمائی کر کے ہمیں اس فن سے متعارف کراتا ہے۔مثلاً کوئی مصور آپ کی رہنمائی نہ کرے تو آپ مصوری کے فن میں طاق نہیں ہو سکتے یا بہ الفاظ دیگر آپ اس کے شاگرد بنتے ہیں، استاد آپ کو بتاتا ہے کہ پینسل کس طرح پکڑی جائے، کس طرح لکیریں کھینچی جائیں اور کس طرح قوس و دائرے بنائے جائیں۔غرض استاد کی رہنمائی میں وہ اپنے اندر چھپی ہوئی تصویر کشی کی صلاحیت کو بیدار کر لیتا ہے۔

یہ حال تو دنیاوی علوم کا ہے جن سے ہم کسی حد تک متعارف ہوتے ہیں۔تو علوم روحانی جو دنیاوی علوم سے بہت زیادہ وسعت کے حامل ہیں ان کو حاصل کرنے کے لئے استاد کی ضرورت کیوں پیش نہیں آئے گی؟ چنانچہ اگر کوئی آدمی اپنے اندر مخفی روحانی صلاحیتوں کو بیدار کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے بھی ایک ایسے شخص کی رہنمائی اور تربیت لازمی ہے جو واقعی صاحب روحانیت ہو۔ایسی صاحب روحانیت ہستی کو پیر و مرشد کہا جاتا ہے۔

سوال: مرشد کامل میں ظاہر طور پر کون کون سی خصوصیات ہونی چاہئیں؟

جواب: یہ بات جاننے کے لئے کہ کوئی شخص واقعی روحانیت سے وقوف رکھتا ہے یا نہیں، یہ ضروری ہے کہ آدمی اس کی صحبت میں بیٹھے، اس کے شب و روز کا بغور مطالعہ کرے اور دیکھے کہ اس شخص کی اللہ کی ذات سے کس حد تک وابستگی ہے۔میرے مرشد کریم قلندر بابا اولیاءؒ نے فرمایا ہے کہ فقیر وہ ہے جس کی صحبت میں بیٹھ کر آدمی کا ذہن اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے اور جتنی دیر آدمی اس کے پاس بیٹھتا ہے، اس کے اوپر سے غم، خوف، اضمحلال اور پریشانی دور رہتی ہے۔

سوال: تصور سے کیا مراد ہے، تصور کی صحیح تعریف کیا ہے؟

جواب: روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ جب ہم کسی چیز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو وہ چیز یا اس کے اندر معنویت ہمارے اوپر ظاہر ہو جاتی ہے۔کوئی چیز ہمارے سامنے ہے لیکن ذہنی طور پر ہم اس کی طرف متوجہ نہیں تو وہ چیز بسا

اوقات ہمارے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتی ۔اس کی مثال یہ ہے کہ ہم گھر سے دفتر جانے کیلئے راستے اختیار کرتے ہیں ۔جب ہم گھر سے روانہ ہوتے ہیں تو ہمارے ذہن کی مرکزیت صرف دفتر ہوتا ہے یعنی یہ کہ ہمیں مقررہ وقت پر دفتر پہنچنا ہے اور وہاں پر اپنی ذمہ داریاں پوری کرنی ہیں ۔اب راستے میں بے شمار مختلف النوع چیزیں ہمارے سامنے آتی ہیں اور انہیں ہم دیکھتے ہیں لیکن دفتر پہنچنے کے بعد کوئی صاحب اگر ہم سے سوال کریں کہ راستے میں آپ نے کیا کچھ دیکھا تو اس بات کا ہمارے پاس ایک ہی جواب ہوگا کہ ہم نے دھیان نہیں دیا حالانکہ سب چیزیں نظروں کے سامنے سے گزریں لیکن کسی بھی چیز میں ذہنی مرکزیت قائم نہ تھی، اس لئے حافظہ پر اس کا نقش مرتب نہ ہوسکا ۔آپ ایک ایسی کتاب پڑھتے ہیں جس کا مضمون آپ کی دلچسپی کے برعکس ہے تو پانچ دس منٹ کے بعد ہی طبیعت پر بوجھ محسوس ہونے لگتا ہے اور بالآخر کتاب چھوڑ دیتے ہیں ۔اس مثال سے دوسرا قانون یہ بنا کہ ذہنی مرکزیت کے ساتھ ساتھ اگر دلچسپی قائم ہو تو کام آسان ہو جاتا ہے ۔جہاں تک دلچسپی کا تعلق ہے اس کی حدود اگر متعین کی جائیں تو دو رخ پر متعین ہوں جس کی عرف عام میں ذوق وشوق کہا جاتا ہے یعنی ایک طرف کسی چیز کی معنویت کو تلاش کرنے کی جستجو ہے اور دوسری طرف اس جستجو کے نتیجے میں کوئی چیز حاصل کرنے کی کوشش ہے ۔ذوق وجستجو کے بعد جب کوئی بندہ کسی راستے کو اختیار کرتا ہے تو وہ راستہ دین کا ہو یا دنیا کا اس کے مثبت نتائج مرتب ہوتے ہیں ۔

تصور کا منشا یہی ہے کہ آدمی ذوق وشوق کے ساتھ ذہنی مرکزیت اور اس کے نتیجے میں باطنی علم حاصل کرے۔

تصور کی مشقوں سے بھر پور فوائد حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ صاحب مشق جب آنکھیں بند کر کے تصور کرے تو اسے خود سے اور ماحول سے بے نیاز ہو جانا چاہئے، اتنا بے نیاز کہ اس کے اوپر بتدریج ٹائم اور اسپیس کی گرفت ٹوٹنے لگے یعنی اس تصور میں اتنا منہمک ہو جائے کہ گزرے ہوئے وقت کا مطلق احساس نہ ہو ۔کتاب کا دلچسپ مضمون پڑھنے کی مثال پیش کی جاسکتی ہے ۔

تصور کے ضمن میں اس بات کو سمجھنا بہت ضروری ہے کہ اگر آپ نور یا روشنی کا تصور کر رہے ہیں تو آنکھیں بند کر کے کسی خاص قسم کی روشنی کو دیکھنے کی کوشش نہ کریں بلکہ صرف نور کی طرف دھیان دیں ۔نور جو کچھ بھی ہے اور جس طرح بھی ہے از خود آپ کے سامنے آجائے گا ۔اصل مدعا کسی ایک طرف دھیان کر کے ذہنی سکون حاصل کرنا اور منتشر خیالات سے نجات حاصل کرنا ہے جس کے بعد باطنی علم کڑی در کڑی ذہن پر منکشف ہونے لگتا ہے ۔تصور کا مطلب اس بات سے کافی حد تک پورا ہو جاتا ہے، جس کو عرف عام میں ”بے خیال“ ہونا کہتے ہیں ۔

سوال: علم حضوری کیا ہے اور علم حضوری اور علم حصولی میں کیا فرق ہے؟

جواب: علم حضوری وہ علم ہے جو ہمیں غیب کی دنیا میں داخل کر کے غیب سے متعارف کراتا ہے۔ یہ وہ علم ہے جس کی حیثیت براہ راست ایک اطلاع کی ہے یعنی علم حضوری سیکھنے والے بندے کے اندر لاشعوری تحریکات عمل میں آ جاتی ہیں۔ لاشعوری تحریکات عمل میں آنے سے مراد یہ ہے کہ حافظہ کے اوپر ان باتوں کا جو بیان کی جا رہی ہیں ایک نقش ابھرتا ہے مثلاً علم حضور سکھانے والا کوئی استاد اگر "کبوتر" کہتا ہے تو حافظے کی سطح پر یا ذہن کی اسکرین پر کبوتر کا ایک خاکہ سا بنتا ہے اور جب الفاظ کے اندر گہرائی پیدا ہوتی ہے تو دماغ کے اندر فی الواقع کبوتر اپنے پورے خدوخال کے ساتھ بیٹھا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی طرح جب ایک استاد کسی سیارے یا ستارے کا تذکرہ کرتا ہے تو حافظہ کی اسکرین پر روشن اور دہکتا ہوا ستارہ محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح روحانی استاد جب جنت کا تذکرہ کرتا ہے تو جنت سے متعلق جو اطلاعات ہمیں مل چکی ہیں، ان اطلاعات کی ایک فلم دماغ کے اندر ڈسپلے (DISPLAY) ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے ذہن کے اندر یہ بات ہمیں نقش نظر آتی ہے کہ جنت ایسا باغ ہے جس میں خوبصورت خوبصورت پھول ہیں، دودھ کی طرح سفید پانی کی نہریں ہیں۔ شہد کی طرح میٹھے پانی کی نہریں ہیں اور وہاں ایسے خوبصورت مناظر ہیں جن کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔

علم حضوری اور علم حصولی میں یہ فرق ہے کہ جب کوئی استاد اپنے کسی شاگرد کو تصویر بنانا سکھاتا ہے تو وہ گراف کے اوپر تصویر بنا دیتا ہے اور وہ یہ بتا دیتا ہے کہ اتنے خانوں کو اس طرح کاٹ دیا جائے تو آنکھ بن جاتی ہے اور اتنی تعداد میں خانوں کے اوپر پینسل پھیر دی جائے تو ناک بن جاتی ہے۔ گراف کے اندر چھوٹے چھوٹے خانوں کو اس طرح ترتیب سے کاٹا جائے تو سر بن جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور شاگرد جتنے ذوق وشوق سے استاد کی رہنمائی میں ان خانوں کے اندر تصویر کشی کرتا ہے، اسی مناسبت سے وہ فنکار بن جاتا ہے۔ یہ علم حصولی ہے۔ اس کے برعکس علم حضوری ہمیں بتاتا ہے کہ ہر انسان کے اندر تصویر بنانے کی صلاحیت موجود ہے۔ اسی طرح ہر انسان کے اندر کرتہ، قمیض سینے کی صلاحیت موجود ہے۔ استاد کا کام صرف اتنا ہے کہ اس نے شاگرد کے اندر موجود لوہار، درزی، بڑھئی اور مصور بننے کی صلاحیت کو متحرک کر دیا ہے اور جیسے جیسے شاگرد اس صلاحیت سے استفادہ کرتا ہے اپنے فن میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اس بات کی مزید وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے کہ دنیا میں جو کچھ موجود ہے یا آئندہ ہونے والا ہے یا گذر چکا ہے وہ سب خیالات کے اوپر رواں دواں ہے۔ اگر ہمیں کسی چیز کے بارے میں کوئی اطلاع ہے یا بہ الفاظ دیگر اس چیز کا خیال نہیں آتا وہ چیز

ہمارے لئے موجود نہیں ہے۔ جب کوئی آدمی مصور بننا چاہتا ہے تو پہلے اس کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ اسے تصویر بنانی چاہئے، جب کوئی آدمی بڑھئی بننا چاہتا ہے تو پہلے اس کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ اسے بڑھئی کا کام کرنا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ہر علم کی یہی نوعیت ہے۔ پہلے اس علم کے بارے میں ہمارے اندر ایک خیال پیدا ہوتا ہے اور ہم اس خیال کے آنے کے بعد اس مخصوص فن کو یا مخصوص علم کو سیکھنے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور ہمیں ایک استاد کی تلاش ہو جاتی ہے۔ استاد صرف اتنا کام کرتا ہے کہ ہمارے ذوق و شوق کے پیش نظر ہمارے اندر کام کرنے والی صلاحیت کو متحرک کر دیتا ہے۔

سوال: اسم اعظم کیا ہے اور اس کے جاننے سے انسان کے اندر کیا کیا صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں؟

جواب: لوح محفوظ کا قانون ہمیں بتاتا ہے کہ ازل سے ابد تک صرف لفظ کی کارفرمائی ہے۔ حال، مستقبل اور ازل سے ابد تک کا درمیانی فاصلہ ''لفظ'' کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ کائنات میں جو کچھ ہے سب کا سب اللہ کا فرمایا ہوا ''لفظ'' ہے اور یہ لفظ اللہ تعالیٰ کا ''اسم'' ہے۔ اسی اسم کی مختلف طرزوں سے نئی تخلیقات وجود میں آتی رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ کا لفظ یا اسم ہی پوری کائنات کو کنٹرول کرتا ہے۔ لفظ کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ہر قسم کے لفظ یا اسم کا ایک سردار ہوتا ہے اور وہی سردار اپنی قسم کے اسماء کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ سردار اسم بھی اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے اور اسی کو ''اسم اعظم'' کہتے ہیں۔

اسماء کی حیثیت روشنیوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ ایک طرز کی جتنی روشنیاں ہیں ان کو کنٹرول کرنے والا اسم بھی ان ہی روشنیوں کا مرکب ہوتا ہے اور یہ اسماء کائنات میں موجود اشیاء کی تخلیق کے اجزاء ہوتے ہیں مثلاً انسان کے اندر کام کرنے والے تمام تقاضے اور پورے حواس کو قائم کرنے یا رکھنے والا اسم ان سب کا سردار ہوتا ہے اور یہی ''اسم اعظم'' کہلاتا ہے۔

نوع جنات کے لئے الگ اسم اعظم ہے۔ اسی نوع انسان، نوع ملائکہ، نوع جمادات و نباتات کے لئے بھی علیحدہ علیحدہ اسم اعظم ہیں۔ کسی نوع سے متعلق اسم اعظم کو جاننے والا صاحب علم اس نوع کی کامل طرزوں، تقاضوں اور کیفیات کا علم رکھتا ہے۔ اسم ذات کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی ہر صفت کو کامل طرزوں کے ساتھ اپنے اندر رکھتا ہے اور تخلیق میں کام کرنے والا سب کا سب قانون اللہ کا نور ہے۔

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

(اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا)

یہی اللہ کا نور لہروں کی شکل میں نباتات و جمادات، حیوانات، انسان، جنات اور فرشتوں میں زندگی

اور زندگی کی پوری تحریکات پیدا کرتا ہے۔ پوری کائنات میں قدرت کا یہ فیضان ہے کہ کائنات میں ہر فرد نور کی ان لہروں کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔

انسان کے اندر دو حواس کام کرتے ہیں، ایک دن کے اور دوسرے رات کے۔ ان دونوں حواس کی کیفیات کو جمع کرنے پر ان کی تعداد تقریباً گیارہ ہزار ہوتی ہے۔ اور ان گیارہ ہزار کیفیات پر ایک اسم ہمیشہ غالب رہتا ہے یا یوں کہہ لیں کہ زندگی میں اللہ تعالیٰ کے جو اسماء کام کر رہے ہیں ان کی تعداد گیارہ ہزار ہے اور ان گیارہ ہزار اسماء کو جو اسم کنٹرول کر رہا ہے وہ اسم اعظم کہلاتا ہے۔ ان گیارہ ہزار میں سے ساڑھے پانچ ہزار دن میں اور ساڑھے پانچ ہزار رات میں کام کر رہے ہیں۔ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے اس کے اندر کام کرنے والا ہر اسم کسی دوسری نوع کے لئے نئے اسم اعظم کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وہ اسماء ہیں جن کا علم اللہ تعالیٰ نے آدم کو سکھایا ہے۔ تکوین یا اللہ تعالیٰ کے ایڈمنسٹریشن کو چلانے والے حضرات یا صاحب خدمت اپنے اپنے عہدوں کے مطابق ان اسماء کا علم رکھتے ہیں۔

سوال: دیکھنے میں آیا ہے کہ جو بھی عامل یا عالم کوئی وظیفہ بتاتا ہے وہ وظیفہ بعد نماز عشاء کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ یہ نہیں سنا کہ کوئی وظیفہ بعد نماز ظہر اور عصر کیا جائے۔ آخر اس کی توجیہ کیا ہے اور عشاء کا وقت اتنا افضل کیوں ہے؟

جواب: دراصل عشاء کی نماز غیب سے متعارف ہونے اور اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کرنے کا ایک خصوصی پروگرام ہے کیونکہ عشاء کے وقت آدمی رات کے حواس میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روحانی تعلیمات اور تربیت کے اسباق اور وظائف عشا کی نماز کے بعد پورے کئے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ جب آدمی رات کے حواس میں داخل ہوتا ہے تو وہ لاشعوری اور روحانی طور پر غیب کی دنیا سے قریب اور بہت قریب ہو جاتا ہے۔ اس کی دعائیں قبول کر لی جاتی ہیں۔ عشاء کی نماز اس نعمت کا شکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بیداری کے حواس سے نجات عطا فرما کر وہ زندگی عطا فرما دی جو نافرمانی کے ارتکاب سے پہلے جنت میں حضرت آدمؑ کو حاصل تھی۔ یہی وہ حواس ہیں جن میں آدمی خواب دیکھتا ہے اور خواب کے ذریعے اس کے اوپر مشکلات، مسائل اور بیماریوں سے محفوظ رہنے کا انکشاف ہوتا ہے۔

سوال: اکثر پڑھنے اور سننے میں آیا ہے کہ روزہ روح کی بالیدگی کا ذریعہ ہے روزہ روحانی صلاحیتوں کو جلا بخشتا ہے لیکن اس بات کا تسلی بخش جواب نہیں دیا جاتا ہے کہ بھوکا رہنا کس طرح روحانی صلاحیتوں کو بیدار کر کے قرب الٰہی کا باعث بنتا ہے؟

جواب: قرآن پاک کے ارشاد کے مطابق کائنات میں موجود ہر شئے دو رخ پر قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''اور ہم نے ہر شئے کو تخلیق کیا جوڑے دہرے''۔ چنانچہ انسانی حواس بھی دو رخ پر قائم ہیں۔ ایک رخ یہ ہے کہ انسان ہمیشہ خود کو پابند اور مقید محسوس کرتا ہے۔ قید و بند میں ہمارے اندر جو حواس کام کرتے ہیں وہ ہمیشہ اسفل کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ دوسرا رخ وہ ہے جہاں انسان قید و بند سے آزاد ہے۔

زندگی نام ہے تقاضوں کا۔ یہ تقاضے ہی ہمارے اندر حواس بناتے ہیں۔ بھوک، پیاس، جنس، ایک دوسرے سے بات کرنے کی خواہش، آپس کا میل جول اور ہزاروں قسم کی دل چسپیاں سب کے سب تقاضے ہیں۔ اور ان تقاضوں کا دارومدار حواس پر ہے۔ حواس اگر تقاضے قبول کر لیتے ہیں تو یہ تقاضے حواس کے اندر جذب ہو کر ہمیں مظاہراتی خدوخال کا علم بخشتے ہیں۔ عام دنوں میں ہماری دلچسپیاں مظاہر کے ساتھ زیادہ رہتی ہیں۔ کھانا، پینا، سونا، جاگنا، آرام کرنا، حصول معاش میں جدوجہد کرنا، دنیا کے مسائل سب کے سب مظاہر ہیں۔

عام دنوں کے برعکس روزہ، ہمیں ایسے نقطے پر لے آتا ہے جہاں سے مظاہر کی نفی شروع ہوتی ہے مثلاً وقت معینہ تک ظاہری حواس سے توجہ ہٹا کر ذہن کو اس بات پر آمادہ کرنا کہ ظاہری حواس کے علاوہ اور بھی حواس ہمارے اندر موجود ہیں جو ہمیں آزاد دنیا (غیب کی دنیا) سے روشناس کرتے ہیں۔ روزہ زندگی میں کام کرنے والے ظاہر حواس پر ضرب لگا کر ان کو معطل کر دیتا ہے۔ بھوک پیاس پر کنٹرول، گفتگو میں احتیاط، نیند میں کمی اور چوبیس گھنٹے کسی نہ کسی طرح یہ کوشش کی جاتی ہے کہ مظاہر کی گرفت سے نکل کر غیب میں سفر کیا جائے۔

کائنات میں ہر ذی روح کے اندر دو حواس کام کرتے ہیں۔

۱۔ وہ حواس جو اللہ سے قریب کرتے ہیں۔

۲۔ وہ حواس جو اللہ اور بندے کے درمیان فاصلہ بن جاتے ہیں۔

اللہ سے دور کرنے والے حواس سب کے سب مظاہر ہیں اور اللہ سے قریب کرنے والے سب کے سب غیب ہیں۔ مظاہر میں انسان زمان و مکان میں قید و بند ہے اور غیب میں زمانیت اور مکانیت انسان کی پابند ہے۔ جو حواس ہمیں غیب سے روشناس اور متعارف کراتے ہیں۔ قرآن پاک کی زبان میں ان کا نام ''لیل'' یعنی رات ہے۔ رات کے حواس ہوں یا دن کے حواس، دونوں ایک ہی ہیں۔ ان میں صرف درجہ بندی ہوتی رہتی ہے۔ دن کے حواس میں زمان اور مکان کی پابندی لازمی ہے لیکن رات کے حواس میں مکانیت اور زمانیت لازمی نہیں۔ رات کے وہی حواس ہیں جو غیب میں سفر کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں اور ان ہی حواس سے انسان برزخ، اعراف، ملائکہ اور ملاء اعلیٰ کا عرفان حاصل کرتا ہے۔ حضرت موسیٰ کے تذکرے میں ایک جگہ

رب العزت فرماتے ہیں۔ ''اور وعدہ کیا ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا، پورا کیا اس کو دس سے تب پوری ہوئی مدت تیرے رب کی چالیس رات۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ موسیٰ کو چالیس رات میں تورات (غیبی انکشافات) عطا فرمائی۔ فرمان خداوندی بہت زیادہ غور و فکر طلب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے چالیس دن میں وعدہ پورا کیا۔ صرف رات کا تذکرہ فرمایا ہے۔ ظاہر ہے جب حضرت موسیٰ نے چالیس دن اور چالیس رات کوہ طور پر قیام فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ چالیس دن اور چالیس رات حضرت موسیٰ پر رات کے حواس غالب رہے۔ سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی معراج کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندہ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف تا کہ اسے اپنی نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔''

رات کے حواس میں یعنی سونے کی حالت میں ہم نہ کھاتے ہیں اور نہ بات کرتے ہیں اور نہ ارادتاً ذہن کو دنیاوی معاملات میں استعمال کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مظاہراتی پابندی سے بھی آزاد ہو جاتے ہیں۔

روزہ کا پروگرام ہمیں یہی عمل اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ روزے میں تقریباً وہ تمام حواس ہمارے اوپر مسلط ہو جاتے ہیں جن کا نام رات ہے۔

گفتگو میں احتیاط اور زیادہ سے زیادہ عبادت میں مصروف رہنا، بات نہ کرنے کا عمل اور زیادہ عبادت ہمیں غیب سے کرتی ہے۔ ذہن کا اس بات پر مرکوز رہنا کہ یہ کام صرف اللہ کے لئے کر رہے ہیں، ذہن کو دنیا کی طرف سے ہٹاتا ہے۔ زیادہ وقت بیدار رہ کر رات (غیب) کے حواس سے قریب ہونے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ وہی حواس ہیں جن کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے واقعے میں کیا ہے۔ رمضان کا پورا مہینہ دراصل ایک پروگرام ہے اس بات سے متعلق کہ ''انسان اپنی روح اور غیب سے متعارف ہو جائے۔''

اللہ تعالیٰ نے ہمیں دو پروگرام عطا کئے ہیں۔ ''ایک حصول اور دوسرا ترک حصول'' معاشیات حصول کا اصول بتاتا ہے لیکن ترک کا پروگرام اس سے بہت بڑا ہے اور وہ ایسے اصول سکھاتا ہے جو مظاہر سے آہستہ آہستہ دور لے جاتے ہیں۔ اگرچہ انسان مظاہر میں پھنسا رہتا ہے لیکن اس کی روح مظاہر سے ہٹ جاتی ہے اور آہستہ آہستہ اللہ سے قریب ہو جاتی ہے۔ یہ پروگرام آپ کو اللہ کے قریب کر دیتا ہے اور اس قدر قریب کر دیتا ہے کہ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

''میں تمہاری رگِ جان سے زیادہ قریب ہوں۔''

روزے جو حاصل زندگی کی عمومی خواہشات سے ترک ہیں، حواس کو جلا دیتے ہیں اور حواس کو ایک نقطہ پر مجتمع کرتے ہیں۔ عام طور پر مشہور ہے کہ حواس پانچ ہیں۔ ایسا نہیں ہے حواس بہت زیادہ ہیں۔ پانچ ظاہری حواس کے علاوہ پردے میں اور بہت سے حواس ہیں جو ''ترک'' سے منکشف ہوتے ہیں۔ ظاہری حواس اور ظاہری اعمال و خواہشات کا ترک انسان کو خود سے قریب کر دیتا ہے۔ جب آپ انتہائی ترک پر ہوتے ہیں یعنی کم بولتے ہیں، کم سوتے ہیں، کم سوچتے ہیں وغیرہ وغیرہ تو کم سوچنے سے آپ کی فکر کا مجلّی ہونا لازمی ہے۔ ایک روشنی آپ کے دماغ میں، دل میں اور سینہ میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ روشنی اس روشنی سے الگ ہے جو ظاہراً حواس میں کام کرتی ہے۔ یہ روشنی آپ کی فکر میں رہنمائی کرتی ہے۔ یہی روشنی ہے جس کے ذریعے آپ بہت سی باتیں جو مستقبل میں ہونے والی ہیں دیکھ سُن اور سمجھ لیتے ہیں، قرآن پاک نے جس رات کا نام ''لیلتہ القدر'' رکھا ہے وہ دراصل ترک کا پروگرام ہے جو پورے رمضان شریف میں تکمیل پاتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ روزہ میرے لئے ہے اور روزے کی جزاء میں خود ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ ''ہم نے نازل کیا اس کو (قرآن پاک کو) لیلتہ القدر میں، لیلتہ القدر محیط ہے ہزار مہینوں کو، اس رات میں ملائکہ اور ارواح اترتی ہیں اپنے رب کے حکم سے اور یہ رات امان اور سلامتی کی رات ہے طلوع فجر تک۔''

فرمان الٰہی کے مطابق لیلتہ القدر ایک ہزار مہینوں کے دن اور رات کے حواس سے افضل ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے ہم اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ہماری عام رات کے حواس کی مقدار اس رات میں (جو بہتر ہے ہزار مہینوں سے) ساٹھ ہزار گنا بڑھ جاتی ہے کیونکہ ایک ہزار مہینوں میں تیس ہزار دن اور تیس ہزار راتیں ہوتی ہیں۔

سوال: نام کا انسانی زندگی سے کیا رشتہ ہے اور نام مستقبل پر کس حد تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

جواب: نام رکھنے والے انسان ہی ہوتے ہیں، وہ قریبی ہوں یا دور کے رشتہ دار، جب نام رکھا جاتا ہے تو اکثر و بیشتر نانا، دادا، ماں باپ، نانی، دادی اور دوسرے گھر والے اس میں حصہ لیتے ہیں۔ بعض ناموں میں سوچ بچار کو دخل زیادہ ہوتا ہے۔ ایسے نام جن میں سوچ بچار زیادہ ہوتا ہے عام طور پر اعتدال کی زندگی کے خوگر ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سوچ بچار میں بہت سارے خیالات کی لہریں مل جل کر ان ناموں کو متاثر کرتی ہیں اور خیالات کی یہ لہریں تقریباً پورے خاندان کی ذہنی واردات و کیفیات اور عملی زندگی کا عکس ہوتی ہیں۔ بالفاظ دیگر پورے خاندان سے ان ناموں کو کچھ نہ کچھ ورثہ ملتا ہے لیکن بعض نام اس طرح رکھے جاتے ہیں کہ کسی نے سنا لڑکا پیدا ہوا ہے اور اس نے ایک نام تجویز کر دیا۔ یہ نام بغیر کسی ردوبدل کے اس خاص شخص

کی طبیعت قبول کر لیتی ہے جس نے نام رکھا اور یہ طبیعت اس شخص کے لئے جس کا نام رکھا گیا ہے ورثہ بن جاتی ہے۔ بعض نام رؤسا اور خواص کے بچوں کے ہوتے ہیں۔ ان ناموں میں کچھ کچھ ستم شامل ہوتا ہے۔ اس لئے وہ نام ایسے لوگوں کے رکھے ہوئے ہوتے ہیں جن کی کیفیات وواردات ایک دوسرے سے متضاد ہوتی ہیں جن کی بنا پر ان کا مزاج گھڑی گھڑی بدلتا ہے۔ وہ ایک مقام پر جم کر کبھی نہیں ٹھہرتے۔ ان کی طبیعت میں بہت غرور ہوتا ہے اور وہ غرور ان کی زندگی میں قدم قدم آڑے آتا ہے۔ یہ لوگ کانوں کے کچے اور خوشامدی ہوتے ہیں۔ اکثر ان کی جان خطرے میں رہتی ہے۔ بعض بچوں کے نام نہایت بے دلی سے رکھے جاتے ہیں۔ نام کے معنی اور مفہوم پر کوئی غور نہیں کیا جاتا۔ ان بچوں میں اکثریت بداخلاق اور بدتمیز ہوتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ان کی تربیت ہی نہیں ہوتی یا ان کے والدین تربیت سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ زندگی کے کسی موڑ پر آ کر یہ بچے والدین اور معاشرے سے بغاوت کر دیتے ہیں نتیجہ میں بہت سے بچے جرائم پیشہ ہو جاتے ہیں۔ ہماری قوم کی اکثریت تنگ دستی کی وجہ سے معاشرہ کے تمام بندھنوں سے خود کو آزاد تصور کرتی ہے۔ معاشرہ کی پابندی وہ قوم کر سکتی ہے جس میں اعلیٰ تعلیم ہو۔ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ اس کا اخلاق بھی اچھا ہوتا ہے اور پھر اس میں صحیح کمانے کے ذرائع شروع ہی سے پرورش پا جاتے ہیں۔ بہت دکھ کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری قوم میں یہ تمام باتیں مفقود ہیں۔ اگر ایسے نظام میں غور و فکر کے بعد ایسے نام رکھے جائیں جو معانی و مفہوم کے اعتبار سے اچھے ہوں تو اچھے آدمی پیدا ہو سکتے ہیں اور اچھے آدمی بنائے جا سکتے ہیں اس لئے کہ پورے معاشرے کا اثر پوری قوم کے ہر فرد پر پڑتا ہے، اگر فرد باشعور ہو تو اجتماعی شعور کو جانتا ہے اور ساتھ ساتھ اجتماعی شعور رکھتا ہے اور اجتماعی شعور سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ سید عالمین ﷺ کا ارشاد ہے کہ اپنے بچوں کے نام ایسے رکھو جو معانی و مفہوم کے اعتبار سے اچھے ہوں۔

سوال: انسان کی زندگی اطلاعات پر قائم ہے۔ اطلاعات تقاضوں کو جنم دیتی ہے اور تقاضوں کی تکمیل سے زندگی آگے بڑھتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک ہی جیسی اطلاعات سب کو ملتی ہیں تو مقدرات اور نظریات میں تضاد کیوں ہوتا ہے اور انسان ایک طرز پر زندگی کیوں نہیں گزارتے؟

جواب: جس روشنی کے ذریعے ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں اس روشنی کی دو سطحیں ہیں۔ ایک سطح کے حواس میں ثقل اور اُبعاد دونوں شامل ہیں لیکن دوسری سطح میں اُبعاد ہیں۔ ابعاد کی سطح اس روشنی کی گہرائی میں واقع ہے۔ روشنی ہمیں جو اوپری سطح کی اطلاع دیتی ہے حواس انہیں براہ راست دیکھتے اور سنتے ہیں لیکن جو اطلاعات ہمیں نچلی سطح سے پہنچتی ہیں ان کی وصولی کے راستے میں کوئی مزاحمت ضرور ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ حواس ان اطلاعات کی پوری گرفت نہیں کرتے ۔ دراصل جو اطلاعات ہمیں اوپری سطح سے موصول ہوتی ہیں یہی اطلاعات نچلی سطح سے وصول ہونے والی اطلاعات کے راستے میں مزاحمت بن جاتی ہیں گویا کہ ایک طرح کی دیوار کھڑی ہو جاتی ہے ۔ یہ دیوار اتنی سخت ہوتی ہے کہ ہمارے حواس کوشش کے باوجود اسے پار نہیں کر سکتے ۔اوپری سطح کی اطلاعات دو قسم کی ہیں ۔

۱ ۔ وہ اطلاعات جو اغراض پر مبنی ہوں، ان کے ساتھ ہمارا رویہ جانب دارانہ ہوتا ہے ۔

۲ ۔ وہ اطلاعات جو انفرادی مفاد سے وابستہ نہیں ہوتیں ۔ان کے حق میں ہمارا رویہ غیر جانب دارانہ ہوتا ہے ۔اطلاعات کی ان دونوں طرزوں کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ انسان کے پاس ادراک کے دو زاویے ہیں ۔ایک وہ زاویہ جو انفرادیت تک محدود ہے ۔ دوسرا وہ زاویہ جو انفرادیت کی حدود سے باہر ہے لیکن جب ہم انفرادیت کے اندر دیکھتے ہیں تو کائنات شریک نہیں ہوتی لیکن جب ہم انفرادیت سے باہر دیکھتے ہیں تو کائنات شریک ہوتی ہے ۔جس زاویہ میں کائنات شریک ہے اس کے اندر ہم کائنات کی تمام اشیاء کے ساتھ اپنا ادراک کرتے ہیں ۔ادراک کا یہ عمل بار بار ہوتا ہے ۔اسی کو ہم تجرباتی دنیا کہتے ہیں ۔ایک طرف کائنات کو اپنی انفرادی دنیا میں دیکھنے کے عادی ہیں ۔ دوسری طرف اپنی انفرادیت کائنات میں دیکھنے کے عادی ہیں ۔ یہ ایک طرف انفرادیت کی ترجمانی کرتے ہیں اور دوسری طرف کائنات کی جب یہ دونوں ترجمانیاں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں تو انفرادیت کی ترجمانی کو غلط ثابت کرنے کے لئے تاویل کا سہارا لیتے ہیں ۔بعض اوقات تاویل کے حامی اپنے مریضوں سے دست و گریباں ہو جاتے ہیں ۔یہیں سے نظریات کی جنگ شروع ہو جاتی ہے ۔ یہی وہ مرحلہ ہے جب کسی ایسے شخص کی ضرورت پڑتی ہے جو اطلاعات کے روحانی علم سے واقف ہو ۔ذاتی اغراض سے آزاد یہ شخص روحانی انسان ہے جو اپنے شاگردوں کو ذاتی اغراض کے جال سے نکال کر حقیقت سے متعارف کرا دیتا ہے ۔

نماز اور مراقبہ

عالم رنگ و بو میں جتنی اشیاء موجود ہیں وہ سب روشنیوں کے تانے بانے پر نقش ہیں۔ اور اس نقش کی مثال یہ ہے جیسے کپڑے پر کوئی پرنٹ اور قالین میں کوئی تصویر بنی ہوئی ہوتی ہے۔ جس طرح کسی کپڑے کو دیکھنے کے بعد اس کے اوپر رنگ اور نقش و نگار ہمیں نظر آتے ہیں اور تانے بانے کے جن باریک تاروں سے کپڑا بُنا ہوا ہے وہ ہمیں نظر نہیں آتا، اسی طرح انسان بھی مختلف رنگوں اور روشنیوں سے بُنا ہوا ہے۔ مادے سے بنا ہوا گوشت پوست ہمارے سامنے ہے لیکن یہ گوشت پوست کس بساط پر قائم ہے یہ ہماری ظاہری آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ اگر مادہ کی شکست و ریخت کو انتہائی حدود تک پہنچا دیا جائے تو محض رنگوں کی جداگانہ شعاعیں باقی رہ جائیں گی۔ تمام مخلوقات اور موجودات کی مادی زندگی ایسے ہی کیمیائی عمل پر قائم ہے۔ فی الحقیقت لہروں کی مخصوص مقداروں کے ایک جگہ جمع ہو جانے سے مختلف مراحل میں مختلف نوعیں بنتی ہیں۔ اس فارمولے کو بیان کرنے سے منشاء یہ ہے کہ آدمی کی اصل مادہ نہیں ہے بلکہ آدمی کی اصل لہروں کے تانے سے بُنی ہوئی ایک بساط ہے۔ ایک طرف یہ لہریں انسانی جسم کو مادی جسم میں پیش کرتی ہیں اور دوسری طرف یہ لہریں انسان کو روشنیوں کے جسم سے متعارف کراتی ہیں۔ جب تک کوئی آدمی مادے کے اندر قید رہتا ہے اس وقت تک وہ قید و بند اور صعوبت کی زندگی گزارتا ہے اور جب وہ اپنی اصل یعنی روشنی کے جسم سے واقف ہو جاتا ہے تو قید و بند، آلام و مصائب، پیچیدہ اور لاعلاج بیماریوں سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ اصلی آدمی یعنی روشنی کے آدمی سے واقفیت، زمان و مکان (Time and Space) سے آزاد ہونے کی علامت ہے۔ یہ وہی زندگی ہے جہاں غیبی علوم منکشف ہوتے ہیں اور قدم قدم اللہ کے عرفان کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی قربت اور اپنا عرفان حاصل کرنے کے لئے قوانین اور ضابطے بنائے ہیں۔ جو لوگ ان قوانین اور ضابطوں پر عمل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں بلاشبہ وہ لوگ اللہ کے دوست ہیں۔ اللہ کی دوستی حاصل کرنے کے لئے قرآن مجید نے جس پروگرام کا تذکرہ کیا ہے اس میں دو باتیں بہت اہم اور ضروری ہیں۔ ''قائم کرو صلوٰۃ اور ادا کرو زکوٰۃ'' قرآنی پروگرام کے یہ دونوں اجزاء، نماز اور زکوٰۃ، روح اور جسم کا وظیفہ ہیں۔ وظیفہ سے مراد وہ حرکت ہے جو زندگی کی حرکت کو قائم رکھنے کے لئے لازم ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے:

''جب تم نماز میں مشغول ہو تو یہ محسوس کرو کہ ہم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہیں یا یہ محسوس کرو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے۔''

اس ارشاد کی تفصیل پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ نماز میں وظیفہ اعضاء کی حرکت کے

ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع رہنے کی عادت ہونی چاہئے۔

ذہن کا اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہونا روح کا وظیفہ ہے۔ اور اعضاء کا حرکت میں رہنا جسم کا وظیفہ ہے۔ قیام صلوٰۃ کے ذریعے کوئی بندہ اس بات کا عادی ہوسکتا ہے کہ اس کے اوپر زندگی کے ہر شعبے میں اللہ کی طرف متوجہ رہنے کا عمل جاری وساری ہے۔

اس کتابچہ میں سوال و جواب کے آسان طریقے پر بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کا عرفان کس طرح حاصل کرسکتے ہیں۔

سوال: ایسی نماز جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد کے مطابق حضور قلب اور خواہشات، منکرات سے روک دے کس طرح ادا کی جائے؟

جواب: نماز کی فرضیت ہمیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے منتقل ہوئی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ حضور پاک ﷺ پر نماز کب فرض ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نبوت سے پہلے ہی ایسا ذہن عطا فرمایا تھا جس کا رخ نورانی دنیا کی طرف تھا اور نورانی دنیا کی طرف متوجہ رہنے کے لئے حضور ﷺ نے وہ تمام اعمال واشغال ترک فرما دیئے تھے جن سے ذہن کثیف دنیا کی طرف زیادہ مائل رہتا تھا۔ حضور ﷺ کی مقدس زندگی ہمارے سامنے ہے۔ آپ ﷺ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، کبھی خیانت نہیں کی۔ آپ ﷺ سے کبھی ایسا کوئی عمل سرزد نہیں ہوا جو بے حیائی کے زمرے میں آتا ہو۔ آپ ﷺ نے ہمیشہ بے کسوں کی دستگیری کی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ گوشہ نشیں ہو کر اور ہر طرف سے ذہن ہٹا کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے۔ اور آپ ﷺ نے اپنی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف اتنی زیادہ مرکوز فرمائی کہ قربت سے سرفراز ہوئے اور معراج میں اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''ہم نے بندے سے جو دل چاہا باتیں کیں اور جو کچھ دل نے دیکھا جھوٹ نہیں دیکھا۔''

(القرآن)

نماز میں حضور قلب کے لئے ضروری ہے کہ سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوۂ حسنہ پر عمل کیا جائے۔ جس حد تک حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر کسی امتی کا عمل ہوگا اسی مناسبت سے نماز میں حضوری نصیب ہو جائے گی۔ قلب میں جلا پیدا کرنے کے لئے ان چیزوں سے دوری پیدا کرنی ہوگی جو ہمیں پاکیزگی، صفائی اور نورانیت سے دور کرتی ہیں۔ ہمیں اس دماغ کو رد کرنا ہوگا جو ہمارے اندر نافرمانی کا دماغ ہے۔ اس دماغ سے آشنائی حاصل کرنا ہوگی جو جنت کا دماغ ہے اور جس میں تجلیات کا نزول ہوتا ہے۔ یہی دماغ روح کا دماغ

ہے۔آسان الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ جب تک کوئی بندہ اپنی روح سے وقوف حاصل نہیں کر لیتا اس وقت تک نماز میں حضور قلب نصیب نہیں ہوگا۔

سوال: روح کا عرفان کیسے حاصل کیا جائے؟

جواب: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نبوت کے اعلان سے پہلے دنیاوی دلچسپیوں سے عارضی طور پر تعلق خاطر ختم کر کے بستی سے باہر بہت دور ویرانے میں گوشہ نشینی اختیار کر کے غار حرا میں اپنی تمام ذہنی صلاحیتوں کو ایک نقطہ پر مرکوز فرمایا جس کے نتیجے میں حضور ﷺ روح سے واقف ہو گئے۔

قانون:

روح سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ دنیاوی دلچسپیاں کم کر کے زیادہ سے زیادہ وقت ذہن کو اللہ کی طرف متوجہ رکھا جائے۔روحانیت میں ایک نقطے پر توجہ کو مرکوز کرنے کا نام مراقبہ ہے۔یعنی خود آگاہی اور روح سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے مراقبہ کرنا ضروری ہے۔مراقبہ کا مطلب یہ ہے کہ ہر طرف سے توجہ ہٹا کر ایک ذات اقدس واکبر سے ذہنی رابطہ قائم کر لیا جائے۔

جب کسی بندے کا رابطہ اللہ تعالیٰ سے قائم ہو جاتا ہے اور اس کے اوپر سے مفروضہ حواس کی گرفت ٹوٹ جاتی ہے تو وہ مراقبہ کی کیفیت میں داخل ہو جاتا ہے۔مراقبہ ایسے عمل کا نام ہے جس میں کوئی بندہ بیداری کی حالت میں رہ کر بھی اس عالم میں سفر کرتا ہے جس کو ہم روحانی دنیا کہتے ہیں۔روحانی دنیا میں داخل ہونے کے بعد بندہ اس خصوصی تعلق سے واقف ہو جاتا ہے۔جو اللہ اور بندے کے درمیان بحیثیت خالق و مخلوق ہر لمحہ اور ہر آن موجود ہے۔

سوال: مخلوق کو کیوں پیدا کیا گیا؟

جواب: اللہ تعالیٰ ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔اس کا دل چاہا کہ وہ پہچانا جائے سو اس نے اپنی محبت خاص سے تمام مخلوق کو پیدا کیا۔

(حدیث قدسی)

سوال: اللہ تعالیٰ کو پہچاننے کا طریقہ کیا ہے؟

جواب: پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم خود کو پہچانیں اور ہمیں یہ بات معلوم ہو کہ ہم مخلوق ہیں۔اور ہمارا پیدا

کرنے والا اللہ ہے اور جو آدمی پیدا ہوتا ہے بالآخر مر جاتا ہے۔ جب مر جاتا ہے تو گوشت پوست کے جسم کی حیثیت کچھ نہیں رہتی۔ مطلب یہ ہے کہ خود کو پہچاننا اس وقت ممکن ہے جب ہمیں اس بات کا یقین ہو جائے کہ گوشت پوست کا جسم (Fiction) اور مفروضہ ہے۔ گوشت پوست کے آدمی کا دماغ دو حصوں سے مرکب ہے۔ ایک دماغ سیدھی طرف اور دوسرا الٹی طرف ہے۔ سیدھی طرف کے دماغ کا نام لاشعور اور الٹی طرف کے دماغ کا نام شعور ہے۔ سیدھی طرف کے دماغ میں وہ علوم محفوظ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آدم کو سکھائے اور الٹی طرف کے دماغ میں وہ علوم محفوظ ہیں جو نافرمانی کے ارتکاب سے وجود میں آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین ایک نائب بنانے والا ہوں تو فرشتوں نے کہا کیا تو زمین میں ایسے شخص کو نائب بنانا چاہتا ہے جو فساد پھیلائے اور خون بہائے حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح بیان کرتے اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ فرمایا میں جو کچھ جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ اور اللہ نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھائے پھر ان سب چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا، پھر فرمایا مجھے ان کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو۔ انہوں نے کہا تو پاک ہے۔ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تو نے ہمیں بتایا ہے۔ بے شک تو بڑا علم والا، حکمت والا ہے۔ فرمایا اے آدم! ان چیزوں کے نام بتا دو، پھر جب آدم نے ان کے نام انہیں بتائے تو فرمایا کہ میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزیں جانتا ہوں اور جو تم ظاہر کرتے اور جو چھپاتے ہو اسے بھی جانتا ہوں۔'' (آیت ۳۰۔۳۳، سورہ البقرہ)

آیت مبارکہ سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو وہ علوم سکھا دیئے جو فرشتے نہیں جانتے۔ اس علم کی اگر درجہ بندی کی جائے تو چھ عنوان بنتے ہیں اور ہر عنوان ایک دائرہ ہے۔ اس طرح یہ علم چھ دائروں پر محیط ہے۔

سوال: چھ دائرے کیا ہیں؟

جواب: جس طرح کسی مکان کے لئے بنیاد، کرسی کے لئے چار ٹانگوں اور گاڑی کے لئے پہیوں کا ہونا ضروری ہے اسی طرح روح کے اندر تین رخ یا تین پرت کام کر رہے ہیں۔

سوال: تین پرت سے کیا مراد ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

''ہم نے آدم کو علم الاسماء سکھا دیئے۔''

جس وقت اللہ تعالیٰ نے آدم کو علم الاسماء سکھائے اس وقت آدم کے سامنے تین چیزیں تھیں۔ ایک خود آگاہی، دوسرے فرشتے اور تیسری وہ ذات حق جس نے علم سکھایا۔ مفہوم یہ ہے کہ جب آدم کو علم الاسماء سکھایا گیا تو اسے تین علوم منتقل ہوئے۔ اور ہر علم دو رخ سے مرکب ہے۔ اس طرح یہ علم چھ رخ یا چھ دائروں پر محیط ہے۔ ان چھ رخوں یا چھ نقطوں یا چھ دائروں کو روحانیت میں لطائف ستہ (Six Generators) کہا جاتا ہے۔ ان چھ جنریٹرز کے نام یہ ہیں:

پہلا .... جنریٹر نفس

دوسرا .... جنریٹر قلب

تیسرا .... جنریٹر روح

چوتھا .... جنریٹر سر

پانچواں .... جنریٹر خفی

چھٹا .... جنریٹر اخفی

پہلے دو دائروں (Generators) نفس اور قلب کو روح حیوانی کہتے ہیں۔ دوسرے دو دائروں روح اور سر کا نام روح انسانی ہے۔ تیسرے دو دائرے خفی اور اخفی روح اعظم ہے۔

روح حیوانی ان خیالات و احساسات کا مجموعہ ہے جس کو بیداری کہا جاتا ہے۔ آدمی اس آب و گل کی دنیا میں خود کو ہر قدم پر کشش ثقل (Force of Gravitation) میں پابند محسوس کرتا ہے۔ کشش ثقل کی زندگی میں کھانا، پینا، سونا، جاگنا، شادی بیاہ اور دنیاوی سارے کام روح حیوانی کرتی ہے۔

روح انسانی ان احساسات و کیفیات کا مجموعہ ہے جو زندگی گزارنے کے تقاضے فراہم کرتی ہے۔ اور ہمیں اس بات کی اطلاع فراہم کرتی ہے کہ اب ہمیں غذا کی ضرورت ہے۔ اور اب ہمیں پانی کی ضرورت ہے۔ ہم ان تقاضوں کا نام بھوک پیاس وغیرہ وغیرہ رکھتے ہیں۔ بچوں کی پیدائش کا تعلق روح حیوانی سے ہے لیکن ماں کے دل میں بچوں کی محبت بچوں کی پرورش اچھی سے اچھی تربیت کا رجحان روح انسانی کے تقاضے ہیں۔ روح انسانی کے تحت احساسات و کیفیات کو ہم خواب کے نام سے بھی جانتے اور پہچانتے ہیں۔ جب ہم سوتے ہیں تو روح حیوانی کے اوپر نیند طاری ہو جاتی ہے یعنی جب ہم روح انسانی میں زندگی گزارتے ہیں تو ہمارے لئے ہزاروں میل کا سفر کرنا اور دیواروں میں سے پار ہو جانا یا ہزاروں میل کے فاصلے پر کوئی چیز دیکھ لینا، دوسروں تک اپنے خیالات پہنچا دینا، مخاطب کے خیالات پڑھ لینا، جنات اور فرشتوں سے ملاقات کرنا اور مرے ہوئے لوگوں کی روحوں سے ملاقات کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔

روحِ حیوانی کے اندر رہتے ہوئے ہم ہر قدم پر مجبور ہیں، پابند ہیں۔

لیکن روحِ انسانی ہمارے اوپر آزادی کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ایسا دروازہ جس میں ہمارے اوپر سے کششِ ثقل ختم ہو جاتی ہے۔روحِ حیوانی کے حواس میں ہم دیوار کے پیچھے نہیں دیکھ سکتے بلکہ حواس اتنے کمزور ہوتے ہیں کہ اگر ہماری آنکھوں کے سامنے کوئی باریک کاغذ بھی رکھ دیا جائے تو ہم یہ نہیں دیکھ سکتے کہ کاغذ کی دوسری طرف کیا ہے۔

اس کے برعکس روحِ انسانی میں ہمارے حواس اتنے طاقتور ہوتے ہیں کہ ہم زمین کی حدود سے باہر دیکھ لیتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے سورۂ رحمٰن میں فرمایا ہے:

''اے گروہ جنات اور گروہ انسان! تم زمین اور آسمان کے کناروں سے نکل کر دکھاؤ، تم نہیں نکل سکتے مگر سلطان سے۔''

تصوف میں سلطان کا ترجمہ روحِ انسانی ہے یعنی انسان کے اندر جب روحِ انسانی کے حواس کام کرنے لگتے ہیں تو وہ زمین و آسمان کے کناروں سے نکل جاتا ہے۔

سوال: روحِ انسانی سے آشنا ہونے کا طریقہ کیا ہے؟

جواب: ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ جب پوری توجہ کے ساتھ کسی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں تو باقی دوسری باتیں عالمِ بے خیالی میں چلی جاتی ہیں۔کسی ایک بات پر ہماری توجہ مستقل مرکوز رہے تو وہ بات پوری ہو جاتی ہے۔مثلاً ہم کسی دوست یا رشتہ دار کے بارے میں سوچتے ہیں اور اس طرح سوچتے ہیں کہ ہمارا ذہن ہر طرف سے ہٹ کر اس کی شخصیت میں جذب ہو جائے تو وہ ہمارے سامنے آموجود ہوتا ہے۔

روحِ اعظم میں وہ علوم مخفی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی تجلی، مشیت اور حکمت سے متعلق ہیں۔اس دائرے سے متعارف بندہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا عارف ہوتا ہے۔یہی برگزیدہ بندے ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

''میرا بندہ اپنی طاعتوں سے مجھ سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔یہاں تک کہ میں وہ آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، وہ کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جس کے ذریعے وہ پکڑتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ سے قربت غیب کی دنیا میں داخل ہوئے بغیر ممکن نہیں۔غیب کے عالم میں داخل ہونا یا زمان و مکان سے ماوراء کسی چیز کو دیکھنا اس وقت ممکن ہے جب آدمی زمان و مکان سے آزاد ہونے کے طریقے سے واقف ہو۔

آیئے تلاش کریں کہ آدمی کے حواس زمان و مکان کی گرفت سے کیسے آزاد ہوتے ہیں۔

مثال:

ہم کسی ایسی کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں جو اتنی دل چسپ ہے کہ ہم ماحول سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ کتاب ختم کرنے کے بعد ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کئی گھنٹے گزر گئے ہیں اور ہمیں وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوا تو بڑی حیرت ہوتی ہے کہ اتنا طویل وقت کیسے گزر گیا اسی طرح جب ہم نیند کی آغوش میں چلے جاتے ہیں تو وقت کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔قرآن پاک کے مطابق نیند رات ہے اور بیداری دن ہے۔

''ہم داخل کرتے ہیں رات کو دن میں اور داخل کرتے ہیں دن کو رات میں۔''(القرآن)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

''ہم نکالتے ہیں رات کو دن میں سے اور دن کو رات میں سے۔''(القرآن)

تیسری جگہ ارشاد ہے:

''ہم ادھیڑ لیتے ہیں رات پر سے دن کو اور دن پر سے رات کو۔'' (القرآن)

اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات میں تفکر کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ رات اور دن میں دو حواس ہیں۔یعنی ہماری زندگی دو حواسوں میں منقسم ہے یا ہماری زندگی دو حواسوں میں سفر کرتی ہے۔ایک حواس کا نام دن ہے، دوسرے حواس کا نام رات ہے۔دن کے حواس میں ہمارے اوپر زمان و مکان کی جکڑ بندیاں مسلط ہیں۔اور رات کے حواس میں ہم زمان و مکان کی قید سے آزاد ہیں۔

قانون یہ بنا کہ اگر کوئی انسان اپنے اوپر رات اور دن کے وقفے میں رات کے حواس غالب کر لے تو وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے اور زمان و مکان سے آزادی دراصل غیبی انکشافات کا ذریعہ ہے۔

قرآن پاک نے اس پروگرام اور اس عمل کا نام ''قیام صلوٰۃ'' رکھا ہے جس کے ذریعے دن کے حواس سے آزادی حاصل کر کے رات کے حواس میں سفر کیا جا سکتا ہے۔دوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہئے کہ نماز قائم کرنے کا لازمی نتیجہ دن کے حواس کی نفی اور رات کے حواس میں مرکزیت حاصل ہونا ہے۔نماز کے ساتھ لفظ ''قائم کرنا'' اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔اگر کوئی نماز اپنی اس بنیادی شرط کو پورا نہیں کرتی تو وہ کسی شخص کو رات کے حواس سے متعارف کرا دے تو وہ حقیقی نماز نہیں ہے۔

آدمی جب مراقبہ کرتا ہے تو اس کے اوپر سے دن کے حواس کی گرفت کمزور ہو جاتی ہے اور وہ بیدار رہتے ہوئے بھی ٹائم اسپیس سے آزاد حواس (رات کے حواس) میں چلا جاتا ہے۔جو دراصل غیبی انکشافات کا ذریعہ ہیں۔اس سلسلے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مشہور واقعہ سامنے لانا بھی نماز کی تشریح اور وضاحت میں

معاون ثابت ہوگا۔ کسی جنگ میں دشمن کا ایک تیر حضرت علی کرم اللہ وجہ کی پنڈلی میں پیوست ہو گیا۔ جب اس تیر کو نکالنے کی کوشش کی گئی تو حضرت علیؓ نے تکلیف محسوس کی اور فرمایا:

''میں نماز قائم کرتا ہوں۔''

حضرت علیؓ نے نیت باندھی اور لوگوں نے تیر کھینچ کر مرہم پٹی کر دی۔ حضرت علیؓ کو اس بات کا احساس تک نہ ہوا کہ تیر نکال کر مرہم پٹی کر دی گئی ہے۔

اس واقعہ سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قیام نماز میں ان حواس کی نفی ہو جاتی ہے جن میں تکلیف، جراحت اور پابندی موجود ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ نے جب نماز کی نیت باندھی تو وہ دن کے حواس سے نکل کر رات کے ان حواس میں پہنچ گئے جو انسان کو غیب کی دنیا میں لے جاتے ہیں۔

روحانیت کی بنیاد اس حقیقت پر قائم ہے کہ انسان کے اندر دو حواس، دو دماغ اور دو زندگیاں سرگرم عمل ہیں۔ جیسے ایک ورق کے دو صفحات ہوتے ہیں دو صفحے الگ الگ ہونے کے باوجود ورق کی اپنی حیثیت ایک ہی رہتی ہے۔ دو حواس یا دو زندگیوں میں سے ایک کا نام پابندی ہے اور دوسری کا نام آزادی ہے۔ پابند زندگی دن، بیداری اور شعور ہے اور آزاد زندگی رات، سکون، اطمینان قلب اور لاشعور ہے۔

راحت وسکون اور غیب کی دنیا میں داخل ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے اندر اس دنیا کی موجودگی کا یقین ہو۔ یقین ہونا اس لئے ضروری ہے کہ بغیر یقین کے ہم کسی چیز سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ پانی پینے سے پیاس اس لئے بجھ جاتی ہے کہ ہمارے یقین کے اندر یہ بات راسخ ہے کہ پانی پیاس بجھا دیتا ہے ہم زندہ اس لئے ہیں کہ ہمیں اس بات کا یقین حاصل ہے کہ ہم زندہ ہیں۔ جس وقت، جس لمحے اور جس آن زندگی سے متعلق یقین ٹوٹ جاتا ہے، آدمی مر جاتا ہے۔ کسی آدمی کے ذہن میں یہ بات آ جائے اور یقین کا درجہ حاصل کر لے کہ اگر میں گھر سے باہر نکلوں گا تو میرا ایکسیڈنٹ ہو جائے گا تو وہ گھر سے باہر نہیں نکلے گا۔ اسی طرح اگر کسی آدمی کے اندر یہ بات یقین کا درجہ حاصل کر لے کہ کھانا کھانے کے بعد وہ بیمار ہو جائے گا تو وہ کھانا نہیں کھائے گا۔

زندگی کا محاسبہ کیا جائے تو زندگی کے کسی بھی عمل میں ہم اللہ تعالیٰ کی موجودگی اور ربوبیت کا انکار نہیں کر سکتے۔ اس یقین کا مشاہدہ بنانے کے لئے قرآن نے قیام صلوٰۃ کا حکم دیا ہے۔ مقام تفکر ہے کہ غار حرا میں یکسوئی کے ساتھ عبادت و ریاضت (مراقبہ) میں مشغول رہنے کے بعد جب رسول اللہ ﷺ پر غیب منکشف ہوا، اس وقت نماز فرض ہوئی ہے۔ اس سے پہلے امت محمدیہ ﷺ پر نماز فرض نہیں تھی۔ حضور ﷺ کے وارث اولیاء اللہ غار حرا کی زندگی سامنے رکھ کر مراقبہ کی تلقین کرتے ہیں۔ مراقبہ اس عمل اور کوشش کا نام ہے

جس سے انسان کے اندر یقین کی وہ دنیا روشن ہوتی ہے جس پر غیب کی دنیا سے متعارف ہونے کا دارومدار ہے۔ مراقبہ وہ پہلی سنت ہے جس کے نتیجے میں قرآن نازل ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضور خاتم النبیین ﷺ پر اپنی نعمتیں پوری فرمائیں۔ اللہ کو یکتا اور اللہ کے حبیب محمد ﷺ کو اللہ کا سچا رسول ماننے والا جب کوئی بندہ مراقبہ کی کیفیات میں صلوٰۃ قائم کرتا ہے تو اس کے اوپر غیب منکشف ہو جاتا ہے۔

سوال: مراقبہ کیا ہے؟

جواب: ہم یہ بات بتا چکے ہیں کہ انسان کے اندر دو دماغ کام کرتے ہیں۔ ایک دماغ جنت کا دماغ ہے یعنی اس کے ذریعے کوئی بندہ جنت سے آشنا ہوتا ہے۔ اور جنت کی زندگی گزارتا ہے۔ دوسرا دماغ وہ دماغ ہے جو آدم کی نافرمانی کے بعد وجود میں آیا۔ اور آدم نے نافرمانی کے بعد محسوس کیا کہ میں ننگا ہوں۔ ان محسوسات یا نافرمانی کے نتیجے میں جنت نے آدم کو رد کر دیا اور آدم زمین پر پھینک دیا گیا۔ تصوف میں جتنے اسباق اور اوراد و وظائف اور اعمال و اشغال اور مشقیں رائج ہیں ان سب کا منشاء یہ ہے کہ آدم زاد اپنا کھویا ہوا وطن واپس حاصل کرے۔ سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان تمام اوراد و وظائف اور اعمال و اشغال اور مشقوں کو نماز میں سمو دیا ہے۔ ہم جب نماز کی حقیقت اور نماز کے ارکان پر غور کرتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نماز میں زندگی کے ہر عمل کو سمو دیا گیا ہے۔ چونکہ قیام صلوٰۃ کا ترجمہ ربط قائم کرنا ہے اس لئے ضروری ہوا کہ کوئی ایسا عمل تجویز کیا جائے جس عمل میں زندگی کی تمام حرکات و سکنات موجود ہوں اور ہر عمل اور ہر حرکت کے ساتھ آدمی کا رابطہ اللہ کے ساتھ قائم ہو۔

مراقبہ کے معنی ہیں کہ تمام طرف سے ذہن ہٹا کر ایک نقطہ پر اپنی پوری توجہ مرکوز کرنا اور یہ مرکزیت اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس ہے۔ جب تک کوئی بندہ ذہنی مرکزیت کے قانون سے واقف نہیں ہوتا وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ربط قائم نہیں کر سکتا۔ ربط اور تعلق قائم کرنے کے لئے مراقبہ ضروری ہے۔ مراقبہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہ پہلی سنت ہے جس کے نتیجے میں حضرت جبرئیل سے رسول اللہ ﷺ کی گفتگو ہوئی اور ہادی برحق سرور کائنات سرکار دو عالم سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر قرآن نازل ہوا۔

سوال: مراقبہ کیسے کیا جائے؟

جواب: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہر امتی یہ بات جانتا ہے کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے غار حرا میں

طویل عرصے تک عبادت و ریاضت کی ہے۔ دنیاوی معاملات، بیوی بچوں کے مسائل، دوست احباب کے تعلقات سے عارضی طور پر رشتہ منقطع کر کے یکسوئی کے ساتھ کسی گوشے میں بیٹھ کر اللہ کی طرف متوجہ ہونا مراقبہ ہے۔

صاحب مراقبہ کے لئے ضروری ہے کہ جس جگہ مراقبہ کیا جائے وہاں شور وشغب نہ ہو، اس جگہ اندھیرا ہو۔ جتنی دیر اس جگہ گوشے میں بیٹھا جائے اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ ذہن کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رکھے۔ بند آنکھوں سے یہ تصور کرے کہ مجھے اللہ دیکھ رہا ہے۔

پرہیز واحتیاط:

۱۔ مٹھاس کم سے کم استعمال کی جائے۔

۲۔ کوشش کی جائے کہ کسی قسم کا نشہ استعمال نہ کیا جائے اور اگر عادت ہے تو کم سے کم استعمال میں آئے۔

۳۔ کھانا آدھا پیٹ کھایا جائے۔

۴۔ ضرورت کے مطابق نیند پوری کی جائے اور زیادہ دیر بیدار رہے۔

۵۔ بولنے میں احتیاط اختیار کی جائے ،صرف ضرورت کے مطابق بولا جائے۔

۶۔ عیب جوئی اور غیبت کو اپنے قریب نہ آنے دے۔

۷۔ جھوٹ کو اپنی زندگی سے یکسر خارج کر دے۔

۸۔ مراقبہ کے وقت کانوں میں روئی رکھے۔

۹۔ مراقبہ ایسی نشست سے کرے جس میں آرام ملے لیکن یہ ضروری ہے کہ کمر سیدھی رہے اس طرح سیدھی رہے کہ ریڑھ کی ہڈی میں تناؤ واقع نہ ہو۔

۱۰۔ مراقبہ کرنے سے پہلے ناک کے دونوں نتھنوں سے آہستہ آہستہ سانس لیا جائے اور سینہ میں روکے بغیر خارج کر دیا جائے۔ سانس کا یہ عمل سکت اور طاقت کے مطابق پانچ سے اکیس بار تک کرے۔

۱۱۔ سانس کی مشق شمال رخ بیٹھ کر کی جائے۔

۱۲۔ پانچ وقت نماز ادا کرنے سے پہلے مراقبہ میں بیٹھ کر یہ تصور قائم کیا جائے کہ مجھے اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ تصور اتنا گہرا ہو جاتا ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے ہر عمل اور ہر حرکت میں یہ دیکھنے لگتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے۔

مراقبہ کی یہ کیفیت مرتبہ احسان کا ایک درجہ ہے۔ جب کوئی بندہ اس کیفیت کے ساتھ مراقبہ کرتا ہے تو

اس کے اوپر غیب کی دنیا کے دروازے کھل جاتے ہیں اور وہ بتدریج ترقی کرتا رہتا ہے۔فرشتے اس سے ہم کلام ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ رکوع وسجود میں شریک ہوتے ہیں۔یہی وہ صلوٰۃ (مراقبہ) ہے جو حضور علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق مومن کی معراج ہے............!

تعارف سلسلہ عالیہ عظیمیہ

اللہ تعالیٰ اپنا پیغام پہنچانے کے لئے چراغ سے چراغ جلاتا ہے معرفت کی مشعل ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں پہنچتی رہتی ہے۔تمام روحانی لوگ قدرت کے وہ ہاتھ ہیں جو یہ مشعل لے کر چلتے ہیں اس روشنی سے وہ لوگ اپنی ذات کو بھی روشن رکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی یہ روشنی پہنچاتے ہیں۔ایسی ہی ایک روحانی ہستی، ایسا ہی ایک روحانی ہاتھ ایسی ہی ایک روشن مشعل سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وارث ابدالِ حق، سلسلہ عظیمیہ کے بانی مبانی رسالہ روحانی ڈائجسٹ کے روح رواں حسن اخریٰ محمد عظیم برخیا قلندر بابا اولیاء رحمتہ اللہ علیہ ہے۔

محمد عظیم: یہ گھریلو نام حضور قلندر بابا اولیاءؒ کی پیدائش کے بعد رکھا گیا۔

سید: آپ کا خاندانی سلسلہ حضرت امام حسن عسکری سے قائم ہے۔

برخیاء: شوقِ شعرو سخن تھا۔برخیاء تخلص ہے۔

قلندر بابا اولیاء: عرفیت ہے مرتبہ قلندریت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کی وجہ سے ملائکہ ارضی و سماوی اور حاملان عرش میں اسی نام سے مشہور ہیں۔اور یہی عرفیت یعنی ''قلندر بابا اولیاء'' عامتہ الناس میں زبان زدعام ہے۔

جائے پیدائش: ۱۸۹۸ء میں قصبہ خورجہ ضلع بلندشہر یوپی (بھارت) میں پیدا ہوئے۔

تعلیم وتربیت: آپؒ نے ابتدائی تعلیم محلّہ کے مکتب سے حاصل کی۔ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد میٹرک ''بلندشہر'' سے کیا۔اور انٹرمیڈیٹ کے لئے داخلہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لیا۔

روحانی تربیت: اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو اپنے کام کے لئے منتخب کرلیتا ہے تو اس کی تربیت کا پورا پورا انتظام کرتا ہے۔یہی کچھ قلندر بابا اولیاءؒ کے ساتھ ہوا۔علی گڑھ میں قیام کے دوران آپ کا میلان درویشی کی طرف بڑھ گیا۔آپؒ وہاں مولانا کابلیؒ کے قبرستان کے حجرے میں زیادہ وقت گزارنے لگے۔صبح تشریف لے جاتے اور رات کو واپس آتے۔

تربیت کا دوسرا دور حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے نانا بابا تاج الدین ناگپوریؒ کی سرپرستی میں شروع ہوا ناگپور میں ۹ سال تک تربیت کا سلسلہ جاری رہا۔

شادی: تربیت کے دوران ہی حضور قلندر بابا اولیاءؒ کی والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ گھر کا نظام چلانے اور بہن بھائیوں کی تربیت کا پیش نظر رکھتے ہوئے نانا تاج الدین ناگپوریؒ کے ارشاد کے مطابق ان کی شادی ہوئی۔

ہجرت: تقسیم ہند کے بعد قلندر بابا اولیاءؒ مع اہل وعیال والد اور بہن بھائیوں کے ساتھ کراچی تشریف لے آئے۔

ذریعہ معاش: کراچی میں ''اردو ڈان'' میں سب ایڈیٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔اس کے بعد ایک عرصہ تک رسالہ ''نقاد'' میں کام کرتے رہے۔

بیعت: سلسلہ سہروردیہ کے بزرگ قطب ارشاد حضرت ابوالفیض قلندر علی سہروردیؒ (بڑے حضرت جی) جب ۱۹۵۶ء میں کراچی تشریف لائے تو قلندر بابا اولیاءؒ نے بیعت ہونے کی درخواست کی۔ بڑے حضرت جیؒ نے فرمایا کہ تین بجے آؤ۔سخت سردی کا عالم تھا۔قلندر بابا اولیاءؒ گرانڈ ہوٹل میکلورڈ روڈ کی سیڑھیوں پر رات دو بجے جا کر بیٹھ گئے۔ٹھیک تین بجے بڑے حضرت جیؒ نے دروازہ کھولا اور اندر بلا لیا۔سامنے بٹھا کر پیشانی پر تین تین پھونکیں ماریں۔پہلی پھونک میں عالم ارواح منکشف ہو گیا۔دوسری پھونک میں عالم ملکوت و جبروت سامنے آ گیا اور تیسری پھونک میں حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے عرش معلی کا مشاہدہ کیا۔

حضرت ابوالفیض قلندر علی سہروردیؒ نے قطب ارشاد کی تعلیمات تین ہفتے میں پوری کر کے خلافت عطا فرمادی۔

اس کے بعد حضرت شیخ نجم الدین کبری رحمتہ اللہ علیہ کی روح پرفتوح نے روحانی تعلیم شروع کی اور پھر یہ سلسلہ یہاں تک پہنچا کہ سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے براہ راست علم لدنی کا علم عطا فرمایا۔اور سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہمت اور نسبت کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں پیشی ہوئی اور اسرار و رموز خود اللہ تعالیٰ نے سکھائے۔

''جن پیغمبروں اور اولیاء اللہ کی ارواح طیبات سے اور جن سلسلوں سے حضور قلندر بابا اولیاءؒ کو نسبت اویسیہ کے تحت فیض حاصل ہوا ہے۔ان کی تفصیل کتاب ''تذکرہ قلندر بابا اولیاءؒ'' میں بیان کی گئی ہے۔''

حضور قلندر بابا اولیاءؒ کا وصال ۲۷ جنوری ۱۹۷۹ء کو ہوا۔

تصنیفات: حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے فیض کو عام کرنے کے لئے سلسلہ عظیمیہ کو تین کتابیں بطور ورثہ منتقل ہوتی ہیں۔

۱۔ علم وعرفان کا سمندر۔رباعیات قلندر بابا اولیاءؒ

۲۔ اسرار اور رموز کا خزانہ ''لوح وقلم''

۳۔ کشف وکرامات اور ماورائی علوم کی توجیہات پر مستند کتاب ''تذکرہ بابا تاج الدین اولیاء''

حامل علم لدنی، واقف اسرار کن فیکون، مرشد کریم، ابدال حق حضرت قلندر بابا اولیاءؒ صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے مگر آپؒ کے مزاج میں احتیاط بہت زیادہ تھی۔آپ کرامت سے طبعاً گریز فرماتے تھے۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں:

''خرق عادت یا کرامت کا ظہور کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے جب کسی بندہ کا شعوری نظام سے خود اختیاری طور پر مغلوب ہو جاتا ہے تو اس سے ایسی باتیں سرزد ہونے لگتی ہیں جو عام طور پر نہیں ہوتیں۔اور لوگ انہیں کرامت کے نام سے یاد کرنے لگتے ہیں۔ جو سب بھان متی ہے۔ اعمال و حرکات میں خرق عادت اور کرامت خود اپنے اختیار سے بھی ظاہر کی جاتی ہے اور کبھی کبھی غیر اختیاری طور پر بھی سرزد ہو جاتی ہے۔خرق عادت آدمی کے اندر ایک ایسا وصف ہے جو مشق کے ذریعے متحرک کیا جا سکتا ہے۔''

موجودہ دور سائنسی دور ہے۔انسان شعوری طور پر اتنا ترقی کر چکا ہے کہ وہ ہر چیز کی حقیقت کو کھلی آنکھ سے دیکھنا چاہتا ہے وہ ایک طرف تو زمین کی انتہائی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے تو دوسری طرف آسمانوں کی رفعت کی پیائش کر رہا ہے۔ایسے حالات میں وہ ہر شئے کی حقیقت کی تلاش میں لگا ہوا ہے۔جس طرح انسان نے ظاہر دنیا میں کامیابیاں حاصل کی ہیں اسی طرح وہ باطنی یا روحانی دنیا کے حقائق جاننے کا خواہاں ہے۔سائنسی ترقی کی وجہ سے انسان کے ذہن کی رفتار بہت تیز ہوگئی ہے۔اور وہ کسی بات کو اس وقت قبول کرتا ہے جب اس بات کے متعلق کیوں، کیسے اور کس لئے کے جوابات اسے مل جائیں۔

انسان نے جس قدر سائنسی ترقی کی ہے اسی قدر وہ مذہب سے دور ہو گیا ہے اور اس کا عقیدہ کمزور ہو

گیا ہے۔ یقین ٹوٹ گیا ہے اور انسان سکون سے نا آشنا ہو گیا ہے۔ سکون کی تلاش و جستجو میں انسان روحانیت کی طرف متوجہ ہوا۔ مگر روحانیت کے حصول کے لئے غیر سائنسی طور طریقوں کو وہ اپنانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کیلئے ایک ایسے روحانی سلسلے کی ضرورت تھی جو وقت کے تقاضوں کے عین مطابق ہو۔ سلسلہ عظیمیہ کا قیام اسی مقصد کے تحت ہوا اور یہ سلسلہ جدید تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سلسلے میں روایتی طور طریقوں کو نظر انداز کر کے جدید طرزیں اختیار کی گئی ہیں۔ جدید افکار و نظریات کی وجہ سے یہ سلسلہ تیزی سے دنیا کے تمام ممالک میں پھیل رہا ہے۔

سنگ بنیاد: عارف باللہ، ابدال حق، واقف رموز لامکانی، حامل علم لدنی، بحر تکوین کے امیر البحر سلسلہ عظیمیہ کے امام، حسن اخریٰ سید محمد عظیم برخیا، حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے دست کرم سے آپ کے نامی اسم گرامی سے منسوب سلسلہ عظیمیہ کی بنیاد، سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ اقدس میں شرف قبولیت کے بعد جولائی ۱۹۶۰ء میں رکھی گئی۔

ایک روز میں نے حضور قلندر بابا اولیاءؒ کی خدمت میں سلسلہ عالیہ عظیمیہ کی بنیاد رکھنے کی درخواست پیش کی۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے یہ درخواست سرور کائنات فخر موجودات سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں پیش کی۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اس درخواست کو قبول فرما کر سلسلہ عالیہ عظیمیہ قائم کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔

خانوادہ سلاسل: سلسلہ عالیہ عظیمیہ جذب و سلوک روحانی شعبوں پر محیط ہے۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ خصوصاً اکیس سلاسل طریقت کے مربی و مشفق ہیں اور مندرجہ ذیل گیارہ سلاسل کے خانوادہ ہیں:

۱۔ قلندریہ: امام سلسلہ حضرت ذوالنون مصریؒ

۲۔ نوریہ: امام سلسلہ حضرت موسیٰ کاظم رضاؒ

۳۔ چشتیہ: امام سلسلہ حضرت ممشاد دینوریؒ

۴۔ نقشبندیہ: امام سلسلہ حضرت شیخ بہاء الحق نقشبند خواجہ باقی اللہؒ

۵۔ سہروردیہ: امام سلسلہ حضرت ابوالقاہرؒ

۶۔ قادریہ: امام سلسلہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

۷۔ طیفوریہ: امام سلسلہ حضرت بایزید بسطامیؒ

۸۔ جنیدیہ: امام سلسلہ حضرت ابوالقاسم جنید بغدادیؒ

۹۔ ملامتیہ: امام سلسلہ حضرت ذوالنون مصریؒ

۱۰۔فردوسیہ: امام سلسلہ حضرت نجم الدین کبریؒ

۱۱۔ تاجیہ: امام سلسلہ حضرت صغریٰ تاج الدینؒ

سلسلہ عظیمیہ میں روایتی پیری مریدی کا مروجہ طریقہ نہیں ہے۔ نہ اس میں کوئی مخصوص لباس ہے نہ کوئی وضع قطع مختص ہے۔ خلوص کے ساتھ طلب روحانیت کا ذوق وشوق ہی طالب کو سلسلہ عظیمیہ سے منسلک رکھتا ہے۔ سلسلہ میں مریدین دوست کے لفظ سے یاد کئے جاتے ہیں۔ تعلیم وتربیت کے سلسلے میں سخت ریاضتوں، چلوں اور مجاہدوں کے بجائے ذکرواشغال نہایت آسان اور مختصر ہیں۔ تعلیم کا محور وہ غارحرا والی عبادت ہے جہاں سرکاردوعالم ﷺ نے طویل عرصہ صرف کیا۔ اس عبادت سے سالک میدان روحانیت میں بہ آسانی گامزن ہوجاتا ہے۔ جوں جوں اس کا قدم آگے بڑھتا ہے اس پر تفکر کے دروازے کھلنے لگتے ہیں۔ لاشعور میں ہر سمت بیداری اور نظر میں اسرار کے پردوں میں جھانکنے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے اور وہ زاہد خشک کے بجائے حق آگاہی کے ایک ہوش مند طالب علم بن جاتا ہے۔ چونکہ امام سلسلہ ابدال حق حضرت قلندر بابا اولیاءؒ شعبہ تکوین کے اعلیٰ ترین عہدے اور قلندریت کے نہاتی بلند مقام پر فائز تھے اس لئے سلسلہ عظیمیہ میں قلندری رنگ مکمل طور پر موجود ہے۔

قلندر عارف باللہ، علم الٰہی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ حق کی عکاسی کرتا ہے۔ انوار محمدی کے طفیل وہ خالق و مخلوق کے درمیان رابطہ بن جاتا ہے کہ ادھر اللہ سے واصل ادھر مخلوق میں شامل فیضان حق سے سیراب ہوتا ہے۔ توحیدی سکون اور حق آگہی کے کیف میں زندگی گزارتا ہے۔ غیب کی ہرراہ اپنی انتہا تک اس کے لئے کھلی ہوتی ہیں۔

قلندر خزائن کن کے انوار کو پالیتا ہے۔ اس کی روح کو ایک انبساط کی کیفیت حاصل ہوتی ہے اور وہ ہر غیر اللہ بشمول خود کی ''لا'' کہہ کے ''الہ'' کا حسن دیکھ لیتا ہے۔

مشاہدہ کرنے والوں نے دیکھا کہ قلندر باباؒ کی محفل میں ان کے دسترخوان پر شیعہ، سُنی، دیوبندی، بریلوی غرض کہ ہر مکتبہ فکر کے لوگ بصد آداب بیٹھے ہوئے نظر آتے تھے۔ قادری، چشتی، نقش بندی، سہروردی ہر سلسلہ روحانی کے تشنہ لبوں کی حضور قلندر بابا اولیاءؒ کی جوئے کرم سے سیرابی ہوتی تھی، قلندر بابا اولیاءؒ کے دریائے فیض کی طغیانی کی یہ کیفیت تھی کہ جس نے بھی ان کا دامن پکڑلیا اللہ تعالی نے اس پر فضل کردیا۔ جس کو قلندر باباؒ نے محبت اور کرم کی نگاہ سے دیکھ لیا اس کی دنیا ہی بدل گئی جس کو ان کی طرز فکر منتقل ہوگئی اس کے نصیب جاگ اٹھے۔ حق آگہی کے شرف سے مشرف ہوگیا۔

مستی خود آگہی قلندر کی ایک شان ہوتی ہے۔ اس کو ذات اور صفات دونوں کی آگہی حاصل ہوتی ہے

وہ اپنے وجود سے گم اور حق میں ضم ہو جاتا ہے۔ یہ ادائے قلندرانہ ہے کہ درویشانہ بے نیازی کے ساتھ تحیر اور لب بندی اس کا شیوہ ہوتی ہے۔

قلندر شہید خفی ہو کر جیتے جی مر کر۔ اپنے وجود میں سبحانیت کا نظارہ کرتا ہے۔ وہ دما دم دم کے کیف دائمی سے سرشار ہوتا ہے۔ حضور کے رشتے میں منسلک من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ کے بھید کا راز دان ہوتا ہے۔ اس کے وجودی کثافتوں کے پردے ہٹ جاتے ہیں اور وہ حق کو حقانیت میں دیکھتا ہے۔

لازوال ہستی اپنی قدرت کا فیضان جاری و ساری رکھنے کے لئے ایسے بندے تخلیق کرتی ہے جو دنیا کی بے ثباتی کا درس دیتے ہیں خالق حقیقی سے تعلق قائم کرنا اور آدم زاد کو اس سے متعارف کرانا ان کا مشن ہوتا ہے۔

سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وارث ابدال حق حسن اخریٰ محمد عظیم برخیاء امام سلسلہ عظیمیہ قلندر بابا اولیاءؒ کی تعلیمات کا نچوڑ یہ ہے کہ انسان کو محض روٹی کپڑے کے حصول اور آسائش و زیبائش ہی کے لئے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ اس کی زندگی کا اولین مقصد یہ ہے کہ وہ خود کو پہچانے اپنے رحمت للعالمین محسن ﷺ کا قلبی اور باطنی تعارف حاصل کرے جس کے جود و کرم اور رحمت سے ہم ایک خوش نصیب قوم ہیں اور ان کی تعلیمات سے انحراف کے نتیجے میں ہم دنیا کی بدنصیب اور بدترین قوم بن چکے ہیں۔

سلسلہ عظیمیہ کے اغراض و مقاصد

۱۔ صراط مستقیم پر گامزن ہو کر دین کی خدمت کرنا۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات پر صدق دل سے عمل کر کے آپ ﷺ کے روحانی مشن کو فروغ دینا۔

۳۔ مخلوق خدا کی خدمت کرنا۔

۴۔ علم دین کے ساتھ ساتھ لوگوں کو روحانی اور سائنسی علوم حاصل کرنے کی ترغیب دینا۔

۵۔ لوگوں کے اندر ایسی طرز فکر پیدا کرنا جس کے ذریعہ وہ روح اور اپنے اندر روحانی صلاحیتوں سے باخبر ہو جائیں۔

۶۔ تمام نوع انسانی کو اپنی برادری سمجھنا، بلاتفریق مذہب و ملت ہر شخص کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا اور حتی المقدور ان
کے ساتھ ہمدردی کرنا۔

قواعد وضوابط

سلسلہ عظیمیہ کے تمام دوستوں کو حسب ذیل احکامات پر پابند رہنا ضروری ہے۔

۱۔ ہر حال و ہر قال میں اپنا روحانی تشخص برقرار رکھیں۔

۲۔ چھوٹے اور بڑے کا امتیاز کئے بغیر سلام میں پہل کریں۔

۳۔ اللہ کی مخلوق کو دوست رکھیں۔

۴۔ سلسلہ میں رہ کر آپس میں اختلاف سے گریز کریں۔شیخ کی ہر بات پر بلاچون وچرا عمل کریں۔

۵۔ اپنے روحانی استاد (شیخ) کی ہر حالت میں بلاچون وچرا عمل کریں۔

۶۔ کسی بھی سلسلہ کے مقابلے میں اپنے سلسلے کو برتر ثابت نہ کریں اس لئے کہ تمام راستے اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں۔

۷۔ سلسہ میں جو شخص گند پھیلانے یا منافقت کا سبب بنے اسے سلسلے سے خارج کر دینا چاہئے۔

۸۔ ذکر و فکر کی جو تعلیم اور ہدایات دی جائیں ان پر پابندی سے عمل کریں۔مراقبہ میں کوتاہی نہ کریں۔

۹۔ قرآن پاک کی تلاوت کریں، معنی اور مفہوم پر غور کریں۔

۱۰۔ صلوٰۃ (نماز) میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ربط قائم کریں۔

۱۱۔ کسی دوسرے سلسلے کے طالب علم یا سالک کو سلسلہ عالیہ عظیمیہ میں طالب کی حیثیت سے قبول کیا جا سکتا ہے۔

۱۲۔ جو شخص پہلے سے کسی سلسلے میں بیعت ہو اسے سلسلہ عالیہ عظیمیہ میں بیعت نہ کریں۔یہ قانون ہے کہ ایک شخص دو جگہ بیعت نہیں ہوسکتا۔

۱۳۔ سلسلہ عالیہ عظیمیہ سے بیعت حاصل کر لینے کے بعد نہ تو بیعت توڑی جا سکتی ہے اور نہ ہی کوئی فرد اپنی مرضی سے فرار حاصل کرسکتا ہے۔اس لئے بیعت کرنے میں جلد بازی کا مظاہرہ نہ کریں جو شخص سلسلہ میں داخل ہونا چاہتا ہے اس سے کہا جائے کہ پہلے خوب اچھی طرح دیکھ بھال کرلی جائے کہ ہم اس لائق ہیں بھی یا نہیں۔

۱۴۔ سلسلہ عالیہ عظیمیہ کے ذمہ دار حضرات پر لازم ہے کہ وہ کسی کو اپنا مرید نہ کہیں۔ ''دوست'' کے لقب سے یاد کریں۔

۱۵۔ سلسلے کا کوئی صاحب مجاز مجلس میں گدی نشین ہو کر نہ بیٹھے نشست و برخاست عوام کی طرح ہو۔

۱۶۔ نوعِ انسان میں مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے سب آپس میں آدم کے ناطے خالق کائنات کے تخلیق رازو نیاز ہیں۔ آپس میں بھائی بہن ہیں۔ نہ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا۔ بڑائی صرف اس کو زیب دیتی ہے جو اپنے اندر ٹھاٹھیں مارتے ہوئے اللہ کی صفات کے سمندر کا عرفان رکھتا ہو جس کے اندر اللہ کے اوصاف کا عکس نمایاں ہو، جو اللہ کی مخلوق کے کام آئے۔ کسی کو اس کی ذات سے تکلیف نہ پہنچے۔

۱۷۔ شک کو دل میں جگہ نہ دیں۔ جس فرد کے دل میں شک جاگزیں ہو، وہ عارف کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ شک شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے جس کے ذریعے وہ آدم زاد کو اپنی روح سے دور کر دیتا ہے۔ روحانی قدروں سے دوامی، آدمی کے اوپر علم و آگاہی اور عرفان کے دروازے بند کر دیتی ہے۔

۱۸۔ مصور ایک تصویر بناتا ہے۔ پہلے وہ خود اس تصویر کے نقش و نگار سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ مصور اپنی بنائی ہوئی تصویر سے اگر خود مطمئن نہ ہو تو دوسرے کیوں کر متاثر ہونگے۔ نہ صرف یہ کہ دوسرے لوگ متاثر نہیں ہوں گے بلکہ تصویر کے خدوخال مذاق کا ہدف بن جائیں گے اور اس طرح خود مصور بے چینی، اضطراب و اضمحلال کے عالم میں چلا جائے گا۔ ایسے کام کریں کہ آپ خود مطمئن ہوں۔ آپ کا ضمیر مردہ نہ ہو جائے اور یہی وہ راز ہے جس کے ذریعہ آپ کی ذات دوسروں کے لئے راہ نمائی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

۱۹۔ ہر شخص کو چاہئے کہ کاروبارِ حیات میں مذہبی قدروں، اخلاقی اور معاشرتی قوانین کا احترام کرتے ہوئے پوری پوری جدوجہد اور کوشش کرے لیکن نتیجہ پر نظر نہ رکھے۔ نتیجہ اللہ کے اوپر چھوڑ دے اس لئے کہ آدمی حالات کے ہاتھ میں کھلونا ہے۔ حالات جس طرح چابی بھر دیتے ہیں آدمی اسی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ بے شک اللہ قادرِ مطلق ہے اور ہر چیز پر محیط ہے۔ حالات پر اس کی گرفت ہے وہ جب چاہے اور جس طرح چاہے حالات میں تغیر واقع ہو جاتا ہے۔ معاش کے حصول میں معاشرتی اخلاقی اور مذہبی قدروں کا پورا پورا احترام کرنا ہر شخص کے اوپر فرض ہے۔

۲۰۔ اگر تم کسی کی دل آزاری کا سبب بن جاؤ تو اس سے معافی مانگ لو، قطع نظر اس کے کہ وہ تم سے چھوٹا ہے یا بڑا۔ اس لئے کہ جھکنے میں عظمت پوشیدہ ہے۔

۲۱۔ تمہیں کسی کی ذات سے تکلیف پہنچ جائے تو اسے بلا توقف معاف کر دو۔ اس لئے کہ انتقام بجائے خود ایک صعوبت ہے انتقام کا جذبہ اعصاب مضمحل کر دیتا ہے۔

۲۲۔ غصہ کی آگ پہلے غصہ کرنیوالے کے خون میں ارتعاش پیدا کرتی ہے۔ اور اس کے اعصاب متاثر ہو کر اپنی انرجی (Energy) ضائع کر دیتے ہیں۔

یاد رکھئے .... شمع پہلے خود جلتی ہے اور جب وہ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ آگ کی نذر کر کے خود کو

فنا کر دیتی ہے تو اس ایثار پر پروانے شمع پر جان نثار ہو جاتے ہیں۔

سلسلہ عظیمیہ تمام نوع انسانی کو ''متحد ہو کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو۔'' کے پلیٹ فارم پر جمع ہونے کی دعوت دیتا ہے۔

مراقبہ سے علاج

جب اللہ تعالیٰ کے ماسوا کوئی چیز موجود نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ میں ایسی مخلوق پیدا کروں جو مجھے جانے اور پہچانے۔ اللہ تعالیٰ نے تخلیق کے فارمولے اپنے ذہن میں کیا بنائے وہ خود جانتے ہیں۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے یہ بات چاہی اور پسند کیا کہ کائنات کو تخلیق کیا جائے۔ چنانچہ کائنات کو پورے خدوخال اور عمل و حرکت کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود تھی۔ کن کہہ کر وجود کا لباس پہنا دیا۔ کائنات (بشمول انسان اور جنات) وجود میں آ گئی لیکن کسی کو یہ علم نہ تھا کہ وہ کون ہے؟ کیوں ہے؟ کیا ہے اور کس لیے ہے؟ اس مرحلے پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں، جنات، فرشتوں اور پوری کائنات کو ان کی حیثیت سے آگاہ کیا۔ یعنی انہیں یہ علم بخشا کہ تمہارا ایک وجود ہے۔ چنانچہ فرمایا ''الست بربکم'' (میں ہوں تمہارا رب) مخلوق کے دماغ کے پردے پر دو باتیں وارد ہوئیں۔ ایک یہ کہ اسے اپنی موجودگی کا احساس ہوا۔ دوسرے اسے یہ علم حاصل ہوا کہ میرے علاوہ مجھے پیدا کرنے والی کوئی اور ہستی بھی ہے۔ مخلوق نے جب اللہ تعالیٰ کی آواز سنی تو اس کے اندر فہم و ادراک اور نظر پیدا ہو گئی اور وہ دریائے حیرت سے نکل کر آواز کی طرف متوجہ ہوئی۔ جیسے ہی توجہ آواز دینے والی ہستی پر مرکوز ہوئی اسے نظر مل گئی۔ نظر کی مرکزیت اللہ تعالیٰ قرار پائے۔ دیکھنے کے بعد مخلوق نے کہا........''قالو بلیٰ'' جی ہاں! ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ آپ ہمارے رب ہیں۔

تفکر کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تخلیق کے پروگرام سے اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ ہے کہ اسے جانا اور پہچانا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پہچاننے کے بے شمار راستے متعین کیے ہیں اور مختلف نوعوں کو پہچاننے کی مختلف صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ حاملان عرش ملائکہ سماوی، کروبی، ملائکہ عنصری سب ہی اللہ تعالیٰ کا عرفان رکھتے ہیں۔ جنات کو بھی اللہ تعالیٰ کے عرفان کی صلاحیت دی گئی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان سب کرداروں میں سب سے زیادہ با صلاحیت کردار انسان کو بنایا۔ یعنی انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایسی صلاحیتیں ودیعت کر دی ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کو کائنات کی تمام مخلوق سے زیادہ قریب سے پہچان سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں ایک کردار جس کو آدم کہا گیا اپنے خصوصی عرفان کے لئے منتخب کیا اور اسے اپنی صفات کا براہ راست علم بخشا اور یہ علم عطا فرمانے کے بعد اس بات کو بھی ظاہر فرما دیا کہ صفات کا یہ خصوصی علم صرف انسان کو حاصل ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''اور ہم نے آدم کو اسماء (صفات) کا علم سکھایا، پھر ان اسماء کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا اگر تم اس علم کو جانتے ہو تو بیان کرو۔''

فرشتوں نے جواب دیا:

''ہم آپ کی پاکی بیان کرتے ہیں اور اس علم سے بے خبر ہیں۔''

بات بالکل واضح ہے کہ آدم کو اللہ تعالیٰ نے وہ خصوصی علم عطا کیا ہے جو اللہ کو پہچاننے کا ذریعہ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''تم ہماری سماعت سے سنتے ہو، ہماری بصارت سے دیکھتے ہو، ہمارے فواد سے سوچتے ہو۔''

''جہاں تم ایک ہو وہاں دوسرا اللہ ہے، جہاں تم دو ہو، وہاں تیسرا اللہ ہے۔''

''اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس نے تمہارا احاطہ کیا ہوا ہے۔''

آدمؑ کی یہ کتنی حرماں نصیبی ہے کہ باوجود اس کے کہ اس کی زندگی کا ہر لمحہ اللہ کے ساتھ وابستہ ہے وہ اپنے اختیاری عمل سے اللہ تعالیٰ سے دور ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عرفان کا خصوصی علم اس کے اندر موجود ہے اور وہ پوری پوری صلاحیتوں سے مالا مال ہے۔ لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ کے علم کے پانے سے محروم ہے۔ یہی بات بتانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبرؑ مبعوث فرمائے اور سب نے یہی بات بتائی کہ تمہارا رشتہ اللہ تعالیٰ سے قریب ترین ہے۔ مگر نوع انسان نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروںؑ کی بات نہیں مانی اور ایک شیطان کی بات پر برابر لبیک کہہ رہی ہے۔

اولیاء اللہ نے بہت سے ایسے طریقے بتائے جن پر چل کر آدمی اپنی بدنصیبی اور محرومی کو ختم کر کے اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کر سکتا ہے۔ ان طریقوں میں سے ایک طریقہ مراقبہ بھی ہے۔

علم یا سائنس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک مادی علم یا مادی سائنس اور دوسرا غیر مادی علم یا روحانی سائنس۔ مادی علوم کو حاصل کرنے یا سمجھنے کے لئے جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے وہ بالواسطہ ہے یعنی ہم راہ راست کسی چیز کو نہیں دیکھ سکتے۔ ہم ایک میڈیم بناتے ہیں اور اس کے ذریعہ چیزوں کی حقیقت معلوم کرتے ہیں۔ مثلاً انسان نے خوردبین بنائی اور پھر اس کے ذریعہ اپنی مادی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کے ذریعہ جو چیز نظر آتی ہے ہم اسے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارا حاصل ہے۔

روحانی علوم میں اس کے برخلاف براہ راست تجربہ اور مشاہدہ کرنے کے لیے آدمی کسی میڈیم کے بغیر اپنے ذہن کو استعمال کرتا ہے وہ ذہن پہلے جس کو خوردبین پر استعمال کیا گیا پھر خوردبین نے اس چیز کو دکھایا۔ اب روحانیت میں خوردبین یا میڈیم درمیان سے ہٹ گیا۔ ذہن نے براہ راست اس چیز کو دیکھا۔ مادی علوم اور روحانی علوم میں جو اہم فرق ہے وہ یہی ہے کہ روحانی علوم میں براہ راست مشاہدہ ہوتا ہے جبکہ مادی علوم میں براہ راست مشاہدہ نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ کہا جائے گا کہ مراقبہ چونکہ براہ راست مشاہدہ اور براہ

راست تجربہ ہے۔اس لئے اس کا روحانیت سے گہرا تعلق ہے۔یہ ایک حقیقت ہے کہ روحانیت اور مراقبہ ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔اب ہم اس طرح کہیں گے کہ روحانیت یا روحانی سائنس کا مطلب ہے اپنے ذہن کو بطور آلہ استعمال کرنا یعنی براہ راست تجربات ومشاہدات روحانی سائنس کا بنیادی عنصر ہے۔اور براہ راست تجربات ومشاہدات روحانی سائنس کا بنیادی عنصر ہے۔اور براہ راست مشاہدے کے روحانیت میں جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اس کا نام مراقبہ ہے۔

مراقبہ نبی کریم ﷺ کی غار حرا والی سنت ہے۔نبی کریم ﷺ شہر چھوڑ کر غار حرا میں جا کر بیٹھ جاتے تھے حالانکہ اس زمانے میں آج کل کی طرح نہ شوروغل تھا نہ اس قسم کے ہنگامے تھے۔شہر پر سکون تھا۔گھر میں بیٹھ کر بھی وہی عمل کیا جاسکتا تھا جو غار حرا میں کیا جاتا تھا مگر قدرت بندوں کو ایک راستہ اور ایک اصول بتانا چاہتی تھی۔جو رہتی دنیا کے لئے ایک مسلمہ اصول بن جائے۔نبوت سے پہلے آپ ﷺ کئی کئی دن لوگوں سے دور رشتہ داروں اور عزیز واقارب سے الگ تھلگ تنہائی میں بیٹھ جاتے تھے اور کائناتی طور پر تفکر کرتے تھے۔سورۂ مزمل کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس عمل کا ذکر کیا ہے۔

ترجمہ:''اور ذکر کیا کرو اپنے رب کے نام کا۔اور سب سے قطع تعلق کر کے اسی طرف متوجہ رہو۔''

یہ آیت ہمیں مراقبہ کا اصول اور طریقہ بتاتی ہے۔مراقبہ کے لئے دو باتیں بڑی واضح طور پر بتائی گئی ہیں۔یعنی اللہ تعالیٰ کا ذکر اور سب سے قطع تعلق ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا۔نماز بھی مراقبہ ہی ہے۔اس میں ہم سب قطع تعلق کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر اس کے ذکر میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

''من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ''

جس نے اپنے نفس کا پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔یہاں نفس سے مراد روح ہے۔جو اپنی روح سے واقف ہو جاتا ہے۔اسے اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل ہو جاتا ہے۔جسے اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل ہو جاتا ہے وہ اس بات سے واقف ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ سے کیا چاہتا ہے اور اس کی تخلیق کا مقصد کیا ہے۔ایسے بندہ کو اللہ تعالیٰ کی توجہ حاصل ہو جاتی ہے۔بندہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیارات منتقل ہو جاتے ہیں۔کائنات اس کے تابع ہو جاتی ہے۔اسی لیے قرآن کریم میں (۷۵۰) ساڑھے سات سو مرتبہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں تفکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں تفکر کرتے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ کی مخفی حکمتیں منکشف ہوتی چلی جاتی ہیں۔دنیا کی تمام ترترقی کا دارومدار اسی تفکر یعنی ''Research'' پر ہے۔کائنات کے راز ان ہی لوگوں

پر کھل رہے ہیں جنہوں نے تفکر کو اپنا لیا ہے۔ تفکر ہی کے نتیجہ میں ریل گاڑی، ہوائی جہاز، موٹر کار، ٹیلی فون، ٹیلی ویژن، کمپیوٹر وغیرہ وجود میں آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون سب کے لئے ہے جو بھی اس پر عمل کرے گا اسے فوائد حاصل ہو جائیں گے مسلم اور غیر مسلم کی اس میں کوئی تخصیص نہیں ہے۔

مراقبہ کی تعریف

مراقبہ کی تعریف مختلف طریقہ سے مندرجہ ذیل انداز میں بیان کی جاتی ہے۔

۱۔ تمام خیالات سے اپنے ذہن کو ہٹا کر کسی ایک نقطہ پر مرکوز کر دیا جاتا ہے۔

۲۔ جب مفروضہ حواس کی گرفت انسان کے اوپر سے ٹوٹ جاتی ہے تو انسان مراقبہ کی کیفیت میں داخل ہو جاتا ہے۔

۳۔ جب انسانی بیداری میں خواب کی حالت طاری کر لے تو وہ مراقبہ میں چلا جاتا ہے۔

۴۔ یہ بات بھی مراقبہ کی تعریف میں آتی ہے کہ انسان دور دراز کی باتیں دیکھ اور سُن لیتا ہے۔

۵۔ شعوری دنیا سے نکل کر لاشعوری دنیا میں جب انسان داخل ہو جاتا ہے تو یہ کیفیت بھی مراقبہ کی کیفیت ہے۔

۶۔ مراقبہ میں بندہ کا ذہن اتنا زیادہ یکسو ہو جاتا ہے کہ وہ دیکھتا ہے کہ مجھے اللہ دیکھ رہا ہے۔

۷۔ ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے کہ مراقبہ (مراقبہ کرنے والا) یہ دیکھتا ہے کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں۔

مراقبہ کے فوائد

مراقبہ کرنے والے بندہ کو مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

۱۔ خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔

۲۔ روحانی طور پر علوم منتقل ہوتے ہیں۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کی توجہ اور قرب جلد حاصل ہوتا ہے۔

۴۔ منتشر خیالی سے نجات حاصل ہوتی ہے۔ ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے۔

۵۔ اخلاقی برائیوں سے نجات حاصل ہو جاتی ہے۔

۶۔ مختلف مسائل حل ہوتے ہیں۔ پریشانیوں سے بچ جاتا ہے۔

۷۔ ایسا بندہ بیمار کم ہوتا ہے۔

۸۔ مراقبہ کے ذریعہ بیماریوں کا علاج کیا جا سکتا ہے۔

۹۔ اللہ تعالیٰ پر یقین مستحکم ہو جاتا ہے۔

۱۰۔ اپنے خیالات دوسروں کو منتقل کیے جا سکتے ہیں۔

مراقبہ کی اقسام

مراقبہ کی یوں تو بے شمار اقسام ہیں مگر یہاں چند کا ذکر کیا جا رہا ہے:

۱۔ تصور شیخ کا مراقبہ

۲۔ نیلی روشنیوں کا مراقبہ

۳۔ مرتبہ احسان کا مراقبہ

۴۔ پھولوں کا مراقبہ

۵۔ دل کے اندر جھانکنے کا مراقبہ وغیرہ

۶۔ بیماریوں سے علاج کا مراقبہ وغیرہ

مراقبہ کرنے کے آداب

۱۔ مراقبہ کرنے کی جگہ ایسی ہونی چاہئے جہاں نہ گرمی ہو نہ سردی ہو۔ معتدل ماحول ہو۔

۲۔ شور وغل اور ہنگاموں سے جگہ پاک ہو۔

۳۔ مراقبہ جہاں کیا جائے وہاں بہتر تو یہی ہے کہ مکمل اندھیرا ہو۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو زیادہ سے زیادہ اندھیرا ہونا چاہئے۔

۴۔ مراقبہ بیٹھ کر کیا جائے۔

۵۔ لیٹ کر مراقبہ کرنے سے نیند کا غلبہ ہو جاتا ہے اور مراقبہ کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

۶۔ مراقبہ کے لئے حالت نشست ایسی ہونی چاہئے جس میں آسانی سے بیٹھ کر مراقبہ کیا جا سکے۔

۷۔ غصہ سے گریز کیا جائے۔

۸۔ نشہ سے بچا جائے۔

۹۔ مراقبہ باوضو کیا جائے۔

۱۰۔ مراقبہ ایک وقت مقرر کر کے کرنا چاہئے۔

۱۱۔ مراقبہ کھانے کے ڈھائی گھنٹے یا اس سے زیادہ وقفہ گزرنے کے بعد کیا جائے۔

۱۲۔ زیادہ سے زیادہ وقت باوضو رہنے کی کوشش کی جائے مگر بول و براز نہ روکا جائے تا کہ طبیعت بھاری نہ ہو۔

مراقبہ کے لئے بہترین اوقات

۱۔ تہجد کے وقت۔

۲۔ نماز فجر سے پہلے یا بعد میں۔

سانس کی مشق

مراقبہ سے پہلے اگر سانس کی مشق مندرجہ ذیل طریقہ سے کی جائے تو اس سے مراقبہ کی کامیابی میں مدد ملتی ہے۔

۱۔ شمال رخ بیٹھ جائیں۔

۲۔ داہنے ہاتھ کے انگوٹھے سے دائیں نتھنے کو اوپر کی طرف بند کر لیں۔

۳۔ بائیں نتھنے سے پانچ سیکنڈ تک سانس اندر کھینچیں۔

۴۔ داہنے نتھنے پر سے انگوٹھا ہٹالیں اور داہنی چھنگلی سے بائیں طرف کے نتھنے کو بند کرلیں۔

۵۔ پانچ سیکنڈ تک سانس روک لیں۔

۶۔ داہنے نتھنے سے سانس کو پانچ سیکنڈ تک باہر نکالیں۔

۷۔ دوبارہ داہنے نتھنے سے سانس پانچ سیکنڈ تک اندر کھینچیں۔

۸۔ اب چھنگلیا ہٹا کر دوبارہ داہنے انگوٹھے سے داہنا نتھنا حسب سابق بند کرلیں اور سانس کو پانچ سیکنڈ تک روکے رکھیں۔ پھر

بائیں نتھنے سے سانس آہستہ آہستہ باہر نکالیں۔

۹۔ نماز ظہر کے بعد۔

۱۰۔ نماز عشاء کے بعد۔

مراقبہ کس طرح کیا جائے

مراقبہ سے پہلے اگر کچھ پڑھنا ہوتو وہ پڑھ کر شمال رخ (اگر مغرب کی طرف منہ کیا جائے تو شمال سیدھے ہاتھ کی طرف ہوگا) آنکھیں بند کر کے بیٹھ جایئے۔(بہتر یہی ہے کہ شمال رخ منہ رہے لیکن کسی بھی رخ پر منہ کر کے مراقبہ کیا جا سکتا ہے۔) ذہن اس طرف متوجہ رکھا جائے جس چیز کا مراقبہ کیا جا رہا ہے۔

چونکہ مراقبہ کے دوران خیالات آتے رہتے ہیں۔اس لئے خیالات میں الجھنا نہیں چاہئے بلکہ ان کو گزر جانے دینا چاہئے اور پھر ذہن کو واپس اسی طرف متوجہ کر دینا چاہئے۔جس چیز کا مراقبہ کیا جا رہا ہو۔کم سے کم ۱۵ سے ۲۰ منٹ مراقبہ کے لئے کافی ہیں۔زیادہ دیر بھی مراقبہ کیا جا سکتا ہے لیکن ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ جس وقت چاہا مراقبہ کے لئے بیٹھ گئے یا تمام چھوڑ کر مراقبہ میں ہی لگے رہیں۔

مراقبہ تخت یا فرش پر کرنا چاہئے۔کرسی،صوفے،گدے یا کسی ایسی چیز پر بیٹھ کر مراقبہ نہیں کرنا چاہئے جس سے ذہنی سکون میں خلل پڑنے کا امکان ہو۔

خیالات میں کشمکش

مراقبہ کے لئے جب کوئی شخص آنکھیں بند کر کے بیٹھتا ہے تو اس کے دماغ میں خیالات کا ہجوم ہوتا ہے۔اِدھراُدھر کے خیالات اتنے آتے ہیں کہ انسان پریشان ہو جاتا ہے۔نہ ذہنی یکسوئی حاصل ہوتی ہے نہ ہی کچھ نظر آتا ہے۔اگر آنے والے خیالات کو روکنے یا رد کرنے کی کوشش کی جائے تو برسوں مراقبہ کرنے کے باوجود انسان ناکام رہتا ہے۔اس لئے خیالات کو روکنے کے بجائے آنے دیا جائے نہ انہیں قبول کرے نہ رد کرے۔آنے والے خیالات خود ہی گزر جائیں گے۔رد کرنے سے وہ ذہن کے ساتھ چپک جائیں گے اور مستقل پریشانی کا باعث بن جائیں گے۔اس کا بہترین حل یہی ہے کہ آنے والے خیالات کو گزر جانے دیا جائے۔

مراقبہ کے ابتدائی دور میں یہ حالت ہوتی ہے کہ بندہ مراقبہ کے لئے بیٹھا اور خیالات کی یلغار شروع ہوگئی۔خیالت کی رو میں بندہ کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔پھر مقصد سے بھٹک جاتا ہے۔اب بندہ کوشش کرتا ہے کہ ذہن ادھر لائے جس مقصد کے لئے مراقبہ کر رہا ہے مگر دماغ میں تو خیالات کو ہٹانے کی کوشش میں خیالات سے جان چھڑائے نہیں چھوٹتی اور مراقبہ کا سارا وقت اسی طرح کشمکش میں گزر جاتا ہے۔خیالات آتے ہیں تو آنے دیں۔خود گزر جائیں گے۔

تصور شیخ

راہ سلوک پر چلنے والے کے ذہن میں معرفت کی بنیادوں کا مستحکم و مضبوط ہونا نہایت ضروری ہے۔ شیخ اپنے شاگرد کے ذہن میں اللہ تعالیٰ کی معرفت کی بنیادیں مستحکم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت کی بنیاد وحدانیت کا ایمان و ایقان ہے۔ وحدانیت کا مطلب یہ ہے کہ تصور ماسوائے اللہ کے ہر شئے سے خالی ہو۔ جب تصور میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا خیال نہیں آتا تو ارادے کی قوت اس تصور کو نقطۂ ذات کی گہرائیوں میں پہنچا دیتی ہے۔ نقطۂ ذات کی انتہائی گہرائی قلب ہے جہاں تصور کا عکس نقش بن جاتا ہے۔ تصور کا ہر نقش اللہ تعالیٰ کے امر کا ایک خاکہ ہے۔ اس واضح خاکہ پر روح یا امر ربی اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس کے امر کا مظاہرہ کرتی ہے۔ یہی مظاہرے (Display) انسان کی زندگی کی حرکات اس کے کام اس کے اعمال ہیں۔

بہترین زندگی گزارنے کے لئے ضروری ہے کہ زندگی کی اعلیٰ قدروں کو پہچانا جائے اور ان قوانین فطرت کو جانا جائے جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے امر کا بہترین مظاہرہ کر سکے۔ کائنات کی ہر تخلیق اور ہر مظاہرہ اللہ تعالیٰ کے امر کی ایک صورت ہے۔ اور امر ربی کی ہر صورت اپنی ذات و صفات میں یکتا ہے۔ کائنات کی ہر شئے کی بنیاد وحدانیت کے نقطہ پر قائم ہے۔ یہی نقطہ ہر شئے کی ذات کا نقطہ ہے۔ جیسے ایٹم کا ہر ذرہ ایٹم ہی ہے کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ انسان کے نقطہ ذات کے ذریعہ وحدانیت کے شعور کے دروازے عقل انسانی پہ کھلتے ہیں۔ مرشد کامل کی نظر کرم سالک کے قلب میں اس دروازے کو کھولنے کا باعث بن جاتی ہے۔ مرشد کا قرب مرید کے لئے ایسا جام عشق ہے جو آہستہ آہستہ مرید اپنے میخانہ دل میں انڈیلتا رہتا ہے۔ ایک وقت ایسا آتا ہے جب مرید کے میخانے کا ہر جام شراب شیخ سے لبریز ہو جاتا ہے۔ کعبہ دل کی ہر دیوار پر اسے شیخ کی تصویر آویزاں دکھائی دیتی ہے۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں شیخ کی تصویر نقش ہو جاتی ہے۔ اس کے حواس پر شیخ کا عشق غلبہ پا لیتا ہے۔ تب اس کا نفس شیخ کے عشق کی تپش سے پگھل کر ایک نقطہ کے برابر رہ جاتا ہے اور یہ نقطہ شیخ کی ذات میں فنا ہو جاتا ہے اور مرید فنا فی الشیخ کے درجے میں قدم رکھتا ہے جہاں اس کی ذات محض ایک نظر کی حیثیت سے باقی رہ جاتی ہے۔ جس کا کام صرف دیکھنا ہے۔ اس کی نظر تصور شیخ کے خاکہ پر ٹھہر جاتی ہے۔ نظر جب تک اس خاکے کو دیکھتی رہتی ہے تفکر ایک ہی نقطے پر قائم رہتا ہے۔ بدلتے لمحات ایک ہی لمحہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ وقت کی گردش رک جاتی ہے۔ زندگی کی رفتار تھم جاتی ہے۔

سالک کی نگاہ اس لمحے شیخ کو رگ جان سے قریب تر دیکھ لیتی ہے۔ اس کی نگاہ اپنے قلب کی انتہائی گہرائی میں پہنچ جاتی ہے جہاں شیخ کا تصور مجسم بن کر تفکر کے دریچے کھول دیتا ہے اور یہ لمحۂ حقیقی ابد کی لامتناہی وسعتوں میں گم ہو جاتا ہے۔ شیخ کے تفکر کی رو اس کے قلب میں بہنے لگتی ہے۔ شیخ کے علوم اس رو کے ذریعہ اس

کے شعور میں منتقل ہونے لگتے ہیں۔ وہ جان لیتا ہے کہ جب تک نقطہ ذات وحدانیت کے نور سے لبریز نہیں ہو جاتا تب تک ذات کے نقطے سے کسی شئے کا باہر آنا ممکن نہیں ہے۔ جب سالک کا نقطہ ذات شیخ کی روشنیوں سے لبریز ہو جاتا ہے تو نور سالک کے لطائف میں ذخیرہ ہو جاتا ہے اور سالک قرب کی منزلیں طے کر لیتا ہے۔

سوال: تصور شیخ کیوں کیا جاتا ہے؟ اللہ کا تصور کیوں قائم نہ کیا جائے؟

جواب: آدم جب تک جنت میں تھے تو دماغ کا وہ حصہ کام کر رہا تھا جو معرفت سے متعلق تھا۔ مگر آدم نے جب نافرمانی کی تو دماغ کے اس حصہ شعور نے کام کرنا شروع کر دیا جو نافرمانی کی وجہ سے متحرک ہو گیا تھا۔ اس لئے شعور میں جو بھی خیالات بنتے ہیں وہ ناقص اور کثیف ہوتے ہیں۔ اس کثیف اور ناقص شعور میں علوم ربانی کی روشنیاں داخل نہیں ہوتیں۔ آدم سڑی ہوئی مٹی سے تخلیق کیے گئے۔ ظاہر ہے کہ وہ تمام خامیاں جو سڑی ہوئی مٹی کی تھیں وہ نسل آدم کو منتقل ہو گئیں۔ یعنی گندگی، غلاظت، تعفن، سڑانڈ اور بدبو وغیرہ۔

سالک جب ان تمام نقائص کو پیش نظر رکھ کر تصور شیخ کرتا ہے تو اس کی اپنی تمام کمزوریاں اس کے سامنے ہوتی ہیں۔ وہ ان تمام خامیوں کو شیخ کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ شیخ مرید پر نظر کرم کرتا ہے۔ اپنی مجلا اور مصفا شخصیت کا عکس مرید کے دل میں منتقل کرتا ہے۔ باطنی طور پر رگڑ رگڑ کر اتنا صاف کر دیتا ہے کہ مرید کا شعور کمسن بچے کی طرح ہو جاتا ہے۔ پھر شیخ اپنے سینے سے اپنے علوم منتقل کرنا شروع کر دیتا ہے۔ تصور شیخ اس لئے کیا جاتا ہے تا کہ شیخ کے علوم مرید میں منتقل ہو جائیں۔

آدمی آنکھیں بند کر کے اندھیرے میں اپنے استاد یا پیرو مرشد کے تصور میں بیٹھ جاتا ہے۔ تصور شیخ کا صحیح مفہوم انخلاء ذہنی ہے۔ مرید اپنے شیخ کو ذہن کا مرکز بنا کر اس کے تصور میں ڈوب جانے کی مشق کرتا ہے۔ یہاں یہ بات سمجھ لینا بہت ضروری ہے کہ تصور شیخ کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ شیخ کی تصویر بنائی جائے یا شیخ کی شکل وصورت کے بارے میں سوچا جائے کہ شیخ کی داڑھی ایسی ہے یا ان کا لباس ایسا ہوتا ہے یا اس طرح کی باتیں سوچی جائیں۔ دراصل شیخ کو ذہن کا مرکز بنا کر اس میں گم ہو جانا یا کھو جانا ہی صحیح طریقہ ہے۔

اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ تصور شیخ کیوں کریں اللہ تعالیٰ کا تصور کیوں نہ کریں تا کہ منزل جلد مل جائے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے آدم کو زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا۔ آدم کو خلیفہ بنانے سے پہلے نیابت اور خلافت کے تمام علوم سکھا کر دنیا میں بھیجا گیا تھا تا کہ وہ اللہ کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق دنیا والوں میں اللہ تعالیٰ کے علوم کو پھیلائیں۔ آدم کے بعد جتنے بھی پیغمبر آئے اللہ تعالیٰ نے ان سب کے لئے یہی کہا کہ وہ

سب بشر تھے۔

سورۃ الانبیاء کی آٹھویں آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''اور نہیں بنائے ہم نے انبیاء کے ایسے جسم جو کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ ہی وہ (اس دنیا میں) ہمیشہ رہنے والے تھے۔''

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو انسانوں کو ہدایت کے لئے بھیجا۔ اس آیت سے پوری طرح وضاحت ہو جاتی ہے کہ انسانوں کی رہنمائی اور ہدایت کے لئے انسانوں کو پیغمبر اور خلیفہ بنا کر بھیجا گیا ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر چلنے کی بجائے نفس کے غلام بن جاتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے دور ہو جاتے ہیں اس لئے وہ علوم انہیں منتقل نہیں ہوتے جو اسماء الٰہیہ کے علوم ہیں چونکہ اللہ تعالیٰ کا ورثہ اسماء الٰہیہ کے علوم بندوں تک پہنچانے کا کام اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اور نائب آدم ہے اور آدم انسان ہے، بشر ہے اس کے اندر انسانوں والی تمام باتیں موجود ہیں اور وہ بشری تقاضے رکھتا ہے۔ اب جب کہ نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے پیغمبر آنے بند ہو گئے ہیں تو ہدایت کا کام رسول اللہ ﷺ کی امت کے اولیاء اللہ نے انجام دینا شروع کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تصور شیخ کی تلقین کی جاتی ہے۔

نیلی روشنی کا مراقبہ

جہاں تک مادی وسائل آسائش اور مادی آرام کا تعلق ہے وہ سکون فراہم نہیں کرتی۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ مادیت آدمی کو سکون فراہم کرنے میں ناکام ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ ۵۰ سال پہلے کے لوگوں کے پاس مادی وسائل کم تھے لیکن انہیں ہم سے زیادہ سکون حاصل تھا۔ آج کے دور میں مادی وسائل ہونے کے باوجود ہمیں وہ سکون حاصل نہیں ہے۔ گھر میں ہر چیز موجود ہے، بچے بھی موجود ہیں، گھر بھی موجود ہے، ٹی وی بھی موجود ہے، گاڑی بھی موجود ہے اور چار پیسے بھی ہیں لیکن دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ جس گھر میں زیادہ وسائل ہیں وہاں زیادہ بے سکونی ہے۔ اس کی ویک وجہ تو یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا تعلق اس بات سے ہے کہ وہ دنیاوی کاموں میں اور دنیاوی چیزوں میں دلچسپی لیتا لے لیکن ہمارا مشاہدہ ہے کہ جب آدمی مر جاتا ہے تو اس کی دلچسپی ہر چیز سے ختم ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت سے آدمی شعوری اعتبار سے کمزور ہو جائے یا باؤلہ ہو جائے تو اس کی بھی دلچسپی کم ہو جاتی ہے۔ وہ لوگ جو (Active) نہیں ہوتے منجمد ہوتے ہیں ان کی بھی دنیاوی دلچسپی کم ہوتی ہے۔ قانون دنیا نام ہی دلچسپی کا ہے۔ جب تک آدمی دنیا میں دلچسپی نہیں لیتا، دنیا اس کے لئے بے کار ہے۔ اب جب تک ہم دنیا میں دلچسپی لیتے ہیں تو اس میں ہماری مصروفیت بھی زیر بحث آتی ہے۔ جب ہماری مصروفیت زیر بحث آتی ہے تو لامحالہ ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ ہماری انرجی کچھ نہ کچھ مصروفیت میں خرچ ہوتی ہے مثلاً شادی بیاہ

کے موقع پر گھر کے آدمی جب مصروف ہوتے ہیں تو ان کے اوپر عجیب قسم کی تھکان ہو جاتی ہے۔ آپ محنت مزدوری کریں اس میں بھی جسم تھک جاتا ہے چاہے وہ کرسی پر بیٹھ کر محنت مزدوری ہو، چاہے وہ زمین کھودنے کی مزدوری ہو، چاہے وہ چٹائی بننے کی مزدوری ہو لیکن جب آپ کسی کام میں دلچسپی لیں گے اور آپ کا جسم حرکت کرے گا۔ بالفاظ دیگر آپ کی انرجی خرچ ہوگی تو آپ تھکیں گے بھی۔ ذہنی تھکان دور کرنے کا جو ہمارے پاس موثر طریقہ ہے وہ سونا ہے یا آرام کرنا ہے۔ یکسوئی کے ساتھ لیٹ جائیں، سو جائیں۔ ایک آدمی بہت زیادہ تھکا ہوا ہے جب وہ سو کر اٹھے گا تو تھکا ہوا نہیں ہوگا۔ انرجی بحال ہو جاتی ہے یا یہ سمجھ لیں کہ سونے سے بیٹری چارج ہو جاتی ہے۔ اب یہ طے ہوا کہ جب ہم دنیا میں کوئی بھی دلچسپی لیتے ہیں یا دنیا کا کوئی بھی کام کرتے ہیں تو ہماری انرجی خرچ ہوتی ہے یا ہماری طاقت خرچ ہوتی ہے۔ اس طاقت کو سائنسدان کیلوریز کہتے ہیں جو انسان کے اندر مخفی ہیں۔ کھانے کی طاقت سے اور پانی پینے سے آکسیجن سے فضا سے کسی بھی صورت سے، بہر حال انسان کے اندر کیلوریز مخفی ہیں اور جیسے آپ محنت کرتے ہیں کیلوریز جلتی ہیں یا خرچ ہوتی ہیں اور جتنی زیادہ جلتی ہیں اسی حساب سے آدمی تھکتا ہے اور کمزور بھی ہوتا ہے۔

مثال: ایک کمرہ ہے اس کمرے میں ایک چارپائی ہے۔ اس چارپائی پر صاف ستھرا بستر ہے۔ اس کے علاوہ کمرے میں کچھ نہیں ہے۔ جب آپ کمرہ میں آرام کے لئے جائیں گے تو آپ کے ذہن میں یہی خیال آئے گا کہ بستر اور تکیہ آرام کے لئے ہے مجھے آرام کر لینا چاہئے۔ مقصد یہ ہوا کہ آپ کی جو کیلوریز خرچ ہوں گی وہ ایک بستر ے، تکیہ اور چارپائی تک محدود رہیں گی۔ یعنی تین چیزوں کا عکس جب آپ کے دماغ میں داخل ہوا اور دماغ نے اس کے نقوش ابھار کر آپ کو یہ بتا دیا کہ یہ بستر ہے تو آپ کی انرجی خرچ ہوئی۔ مثلاً ایک چیز کے لئے ایک کیلوری خرچ ہوئی تو ایک بسترہ، ایک تکیہ، ایک چارپائی اور ایک کمرہ کے لئے چار کیلوریز خرچ ہوئیں۔ اب اسی کمرے میں ٹی وی رکھ دیجئے۔ ٹی وی کا مطلب یہ کہ پانچ کیلوریز خرچ ہوئیں۔ اب ٹی وی پر وگرام دیکھنا شروع کر دیجئے۔ اس کا مطلب یہ کہ ٹی وی کے اندر جتنی بھی تصویریں آئیں گی درخت، پانی، آدمی، گانا بجانا تو ۵۰ چیزوں کا عکس جب آپ کے دماغ کے اندر گیا اور اس عکس کو دماغ نے قبول کر کے آپ کو یہ بتایا کہ یہ درخت ہے، پانی ہے، یہ آدمی ہے، یہ گاتا ہے، یہ بجاتا ہے۔ یہ رنگ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پچاس کیلوریز خرچ ہوئیں یعنی اس کمرے میں جو آپ کے آرام کے لئے آپ نے بنایا۔ اب جہاں چار کیلوریز خرچ ہونی چاہئے تھیں وہاں ۵۴ کیلوریز خرچ ہوئیں۔ اس کے بعد وہاں آپ نے ریڈیو بھی رکھ لیا۔ ریڈیو آپ نے چلایا نہیں تو ۵۴ کے بجائے ۵۵ کیلوریز خرچ ہوئیں۔

کمرہ میں آپ نے الماری بھی سجا دی ہے۔ الماری میں بھی بیس چیزیں رکھیں ہیں مثلاً گڑیا رکھی ہے،

کتاب رکھی ہے، پھولدان رکھا ہے، ایش ٹرے رکھی ہے۔ کچھ بھی رکھا ہے۔ ۲۰ چیزیں رکھی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ۲۰ چیزیں آپ کے دماغ میں نقش ہوئیں اس ہی مناسبت سے کیلوریز خرچ ہوئیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۲۰+۵۵ = ۷۵ کیلوریز خرچ ہوئیں۔ اس کے بعد فرض کیجئے کہ آپ نے کپڑوں کی الماری کے ساتھ کرسی بھی رکھی ہوئی ہے تو اس طرح ایک سیکنڈ میں جہاں ۵ کیلوریز خرچ ہونی چاہئے وہاں ۶۰، ۷۰، ۸۰ کیلوریز جل گئیں۔ وہ کیلوریز جو ہیں دراصل وہ انرجی ہیں۔ آدمی کے اندر قوت حیات ہیں وہی آپ کو زندگی عطا کر رہی ہیں۔ اسی بنیاد پر آپ کی زندگی چل رہی ہے۔ جتنی مادی اشیاء آپ کے اردگرد جمع ہو جائیں گی اسی مناسبت سے آپ کے اندر کیلوریز زیادہ جلیں گی اور خرچ ہوں گی۔ جب آپ کا دماغ تھکے گا۔ دماغ تھکنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا دل بھی تھکا۔ ہاتھ بھی تھکے۔ پیر بھی تھکے۔ پوری باڈی جو جسم کا نظام ہے تھک گیا۔ وہ ڈسٹرب (Disturb) ہو گیا تو مادی وسائل جتنے آپ اکٹھے کرتے چلے جائیں گے اسی مناسبت سے آپ کے اندر سے کیلوریز کا ذخیرہ یعنی قوت حیات جل جائیں گی۔ جب آدمی کے اندر سے اس کی قوت حیات ہی نکل گئی تو سکون کہاں، کیسے ملے گا۔

حضور پاک ﷺ (اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے) اگر ہم آپ ﷺ کی زندگی پر غور کرتے ہیں تو مکے میں ۱۴۰۰ سال پہلے نہ ریڈیو ہے، نہ ٹی وی، نہ موٹر سائیکل ہے، نہ جہاز ہے، نہ دھواں ہے، کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ذہن کو منتشر (Disturb) کرنے والی ہو۔ اگر ہے تو اونٹ ہے، اونٹ جب چلتا ہے تو اس کے پیر کی بھی کوئی آواز نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود مکے کے شہر کا شور، مکے کے شہر کی روشنی، مکے کے شہر میں اونٹوں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی آواز نے حضور پاک ﷺ کو اس طرف متوجہ کیا کہ مکہ چھوڑ کر میلوں دور غار حرا میں تشریف لے گئے۔ حضور پاک ﷺ غار حرا میں کیوں تشریف لے گئے۔ غار حرا میں نہ کوئی چارپائی تھی یعنی مادی وسیلہ سے بنی ہوئی کوئی بھی آسائش کا سامان غار حرا میں موجود نہیں تھا۔ سچی بات ہے کہ حضور پاک ﷺ اس اصول سے واقف تھے (کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر دین کی تکمیل کرنی تھی) کہ ڈسٹربنس (Disturbance) انسان کو سکون سے محروم کر دیتا ہے۔ جتنا آدمی شور شرابے میں رہے گا اتنا ہی بے سکون رہے گا۔ اتنا ہی زیادہ بیزار رہے گا۔ یہی بات آج کی سائنس کہتی ہے۔

آج کی مثال! گاؤں والوں کی صحت اور شہر والوں کی صحت میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ گاؤں والے جو اندرون ملک گاؤں، گوٹھوں میں رہتے ہیں ان کی صحت شہریوں سے زیادہ اچھی ہوتی ہے۔ ان کی آنکھوں پر چشمے کم لگتے ہیں۔ شہر میں رہنے والے بچوں کے کم عمر میں چشمے لگ جاتے ہیں۔ بات کیا ہے؟ وہاں ڈسٹربنس (Disturbance) نہیں ہے۔ شور نہیں ہے، کیلوریز کا ذخیرہ زیادہ رہتا ہے۔ حضور پاک ﷺ

غارِ حرا میں تشریف لے جاتے تھے۔ آپ ﷺ وہاں غور وفکر کرتے تھے۔ بڑی عجیب بات یہ بھی ہے کہ جہاں ڈسٹربنس (Disturbance) ہوتا ہے، جہاں مادیت کا غلبہ ہوتا ہے، جہاں مادیت انسان کو بیزار اور پریشان کرتی ہے وہاں سکون نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت ہے اور تھی کہ تو ریت شہر میں نازل فرمادیتے۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر ۴۰ دن ۴۰ رات قیام کیا۔ کوہ طور پر بھی کوئی آرام و آسائش کا سامان نہیں تھا۔ ایک پہاڑی ایک عصا تھا، ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے۔ انسانی شعور مادیت میں جتنا زیادہ انہماک کرے گا اسی مناسبت سے انسان اپنی روح سے دور ہو جائے گا اور جتنا انسان اپنی روح سے دور ہو جائے گا۔ اسی مناسبت سے انسان بے سکون ہو جائے گا۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں ہماری پریشانی یہ ہے کہ ہم بے سکون ہیں اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے مادیت کو ہی سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ مادیت کو ہی زندگی کا مقصد بنالیا ہے۔ اس وقت جو صورت حال ہے وہ یہ ہے کہ ہم یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہم دنیا کے لئے پیدا کیے گئے ہیں۔ دنیا ہمارے لئے پیدا نہیں کی گئی۔ یعنی ہم دنیا کو نہیں کھا رہے ہیں، دنیا ہمیں کھا رہی ہے۔ اس لیے کہ ہم نے دنیا کو اپنے اوپر افضل قرار دے دیا ہے۔ جب آپ نے دنیا کو خود سے افضل قرار دے دیا تو اپنی حیثیت کم کر دی۔ اب آپ کبھی پرسکون نہیں رہ سکتے۔ صحیح بات یہ ہے کہ دنیا کے لئے ہم نہیں بنائے گئے۔ دنیا کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے بنایا ہے۔ کیا کوئی ایک بندہ بھی یہ بتا سکتا ہے کہ اس کے پیدا ہونے کے بعد دنیا بنی ہے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو دنیا کی ہر چیز موجود ہوتی ہے یا بعد میں پیدا ہوتی ہے؟ آپ کے ابا پیدا ہوئے، آپ کے دادا پیدا ہوئے، پڑدادا پیدا ہوئے، کوئی ایک آدمی تو ایسا بتا دیں (آدم سے لے کر اب تک) کہ جب وہ پیدا ہوا تو اس کے بعد دنیا پیدا ہوئی، ایسا کبھی نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے سے انسان کی خدمت گزاری کے لئے دنیا پیدا کر دی ہے۔ دنیا ہماری خادم ہے، ہم دنیا کے خادم بن گئے ہیں۔ معاملہ بالکل الٹ گیا ہے یعنی ہماری زندگی فطرت کے خلاف ہو گئی ہے۔ اور جب فطرت کے خلاف زندہ رہنا چاہیں گے تو کبھی آپ کو سکون نہیں ملے گا۔ خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”اطمینان قلب، اللہ تعالیٰ کے ذکر سے حاصل ہوتا ہے۔“

مخلوق اور خالق کے درمیان ایک رابطہ اور تعلق ہے۔ اس تعلق کو قائم کرنے سے آدمی کو اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے۔ ایک روحانی آدمی اور ایک غیر روحانی آدمی میں یہی فرق ہے۔ غیر روحانی آدمی دانستہ، نادانستہ یہ سمجھتا ہے کہ میں دنیا کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔ حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے بچہ نو (۹) ماہ ماں کے پیٹ میں رہتا ہے۔ پیدا ہونے کے بعد ۲ یا ۲/۱/۲ سال تک ماں باپ کے دل میں اللہ تعالیٰ شفقت، محبت اور ممتا ڈال کر بچہ کی نشوونما کراتا ہے، سترہ اٹھارہ سال تک ماں باپ یا بڑے بھائی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ جب

انسان اٹھارہ انیس سال کا ہوتا ہے تو سمجھتا ہے کہ میں دنیا کے لئے بنایا گیا ہوں ۔ جب ہم فطرت کے اصولوں کے خلاف بات کریں گے، زندگی گزاریں گے تو ہمیں کسی سمت سے سکون میسر نہیں آ سکتا ۔

نیلی روشنیوں کا مراقبہ

سکون حاصل کرنے کے لئے نیلی روشنی کا مراقبہ نہایت مفید عمل ہے اس مراقبہ سے ول پاور (Will Power) میں اضافہ ہو جاتا ہے اور استاد کی نگرانی میں مسلسل مراقبہ کرنے سے دماغ میں یقین کا پیٹرن کھل جاتا ہے ۔ نیلی روشنی کا مراقبہ کرنے والا بندہ کاروباری خاندانی معاملات اور مستقبل کے بارے میں صحیح فیصلے کرتا ہے ۔

آنکھیں بند کر کے یہ تصور کیا جائے کہ میں آسمان کے نیچے بیٹھا ہوں اور آسمان سے نیلی روشنی نازل ہو کر میرے دماغ میں جمع ہو رہی ہے ۔

مرتبہ احسان کا مراقبہ

۱۰۰ بار درود شریف اور ۱۰۰ بار یاحی یا قیوم پڑھ کر بند آنکھوں سے یہ تصور کیا جائے ۔ ”میں اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں یا اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں ۔“

مراقبہ سے علاج

مندرجہ ذیل مراقبوں کے ذریعے صحت و توانائی اور بیماریوں سے نجات مل جاتی ہے ۔

۱) نیلی روشنیوں کا مراقبہ

دماغی امراض، ریڑھ کی ہڈی، گردن کے مہروں میں خرابی اور ڈپریشن ختم کرنے کے لئے نیلی روشنی کا مراقبہ مفید علاج ہے ۔

۲) زرد روشنیوں کا مراقبہ

نظام ہضم (Digestive System) جیسں ریاح، آنتوں کی دق، پیچس، قبض، بواسیر، معدہ کا

السر وغیرہ کے لئے۔

۳) نارنجی روشنیوں کا مراقبہ

سینہ کے امراض کے لئے (دق، سل، پرانی کھانسی، دمہ وغیرہ)

۴) سبز روشنیوں کا مراقبہ

ہائی بلڈ پریشر اور خون میں حدت سے پیدا ہونے والے امراض، جلدی امراض، خارش، آتشک، سوزاک، چھیپ وغیرہ۔

۵) سرخ روشنیوں کا مراقبہ

لو بلڈ پریشر، انیمیا (Anaemia) گٹھیا، دل کا گھٹنا، دل کا ڈوبنا، توانائی کا کم محسوس ہونا، بزدلی، نروس بریک ڈاؤن، دماغ میں مایوس کن خیالات آنا۔ موت کا خوف، اونچی آواز سے دماغ میں چوٹ محسوس ہونا وغیرہ کے لئے۔

۶) جامنی روشنیوں کا مراقبہ

مردوں کے جنسی امراض اور خواتین کے اندر رحم سے متعلق امراض کے لئے۔

۷) گلابی روشنیوں کا مراقبہ

مرگی۔ دماغی دورے، ذہن اور حافظہ کا ماؤف ہونا۔ دماغی دورے، ڈر اور خوف، عدم تحفظ کا احساس، زندگی سے متعلق منفی خیالات آنا، دنیا بیزاری سے نجات پانے کے لئے۔

نوٹ:

بیماریوں کے علاج کے لئے کوئی بھی مراقبہ معالج کی اجازت اور نگرانی کے بغیر نہ کیا جائے۔

سانس کی لہریں

سوال: سانس کے عمل اور روحانی صلاحیتوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

جواب: زندگی اور زندگی سے متعلق جذبات واحساسات، واردات وکیفیات، تصورات وخیالات اور زندگی سے متعلق تمام دلچسپیاں اس وقت تک قائم ہیں جب تک سانس کی آمد و رفت جاری ہے۔زندگی کا دارومدار سانس کے اوپر قائم ہے۔سانس کی طرزوں پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر ذی روح میں سانس کا نظام قائم و دائم ہے۔لیکن ہر نوع میں سانس کے وقفے متعین ہیں۔مثلاً یہ کہ اگر آدمی کے اندر سانس کے ذریعے دل کی حرکت متعینہ وقت میں ۷۲ ہے تو بکری میں اس سے مختلف ہوگی اور چیونٹی میں اس سے بالکل مختلف ہوگی۔

کوئی ایسا آلہ ایجاد کرلیا جائے کہ جس سے درخت کی سانس کی پیمائش ہوسکے تو اس کے سانس کی دھڑکن بولنے والی مخلوق سے مختلف ہوگی اور اگر ہم کوئی ایسا آلہ ایجاد کرلیں جس سے پہاڑ کی نبضوں کی حرکت ریکارڈ کریں تو وہ درخت کے اندر کام کرنے والی نبضوں کی حرکت سے مختلف ہوگی۔ہر شخص یہ جانتا ہے کہ ایک سانس آتا ہے، ایک سانس جاتا ہے یعنی ایک سانس ہم اندر لیتے ہیں اور ایک سانس باہر نکالتے ہیں۔یہ بات بھی ہم سب کے سامنے ہے کہ پرسکون حالت میں سانس میں ایک خاص قسم کا توازن ہوتا ہے۔اس کے برعکس پریشانی، غم یا اضطراب میں سانس کی کیفیت مختلف ہو جاتی ہے۔مثلاً اگر کوئی آدمی ڈر جائے تو اس کے دل کی حرکت تیز اور بہت تیز ہوجاتی ہے۔اگر غور کریں تو نظر آئے گا کہ دل کی حرکت کے ساتھ سانس کی حرکت بھی تیز ہوجاتی ہے۔

سانس کے دو رخ ہیں۔ایک رخ یہ ہے کہ ہم سانس اندر لیتے ہیں یعنی سانس کے ذریعے آکسیجن جذب کرتے ہیں۔اور دوسرا رخ یہ ہے کہ ہم سانس باہر نکالتے ہیں یعنی کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں۔

یہاں پھر بہت غورطلب نکتہ یہ ہے کہ جب ہم سانس لیتے ہیں تو کوئی چیز اندر جا کر جلتی ہے۔یعنی فضا میں جو آکسیجن پھیلی ہوئی ہے وہ سانس کے ذریعے اندر جا کر جلتی ہے جس طرح گاڑی کے اندر پیٹرول جلتا ہے۔ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جلا ہوا فضلہ باہر نکل جاتا ہے۔یہ سلسلہ پیدائش سے موت تک برقرار رہتا ہے۔ اب ہم اس کو روحانیت کی طرز پر بیان کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق ہر چیز اللہ تعالیٰ کی طرف

سے آئی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ ہم جب اندر سانس لیتے ہیں تو ہمارا رخ باطن (Inner) کی طرف ہوتا ہے۔ ہم جب سانس باہر نکالتے ہیں تو ہماری تمام دلچسپیاں دنیا میں پھیلی ہوئی چیزوں اور اپنے گوشت پوست کے حواس کے ساتھ قائم رہتی ہیں۔ حواس کے دو رخ ہیں۔ ایک رخ وہ ہے جو ہمیں زمان و مکان (Time and Space) میں قید کرتا ہے۔ دوسرا رخ وہ ہے جو ہمیں زمان و مکان سے آزاد کرتا ہے۔ وہ رخ جو ہمیں زمان و مکان سے آزاد کرتا ہے، نیند کی حالت میں ہمارے اوپر غالب رہتا ہے۔ یعنی جب ہم سو جاتے ہیں تو ہمارے شعوری حواس کی نفی ہو جاتی ہے۔ اور ہمارے اوپر سے (Time and Space) کی گرفت ٹوٹ جاتی ہے۔ اور جب ہم بیدار ہو جاتے ہیں تو (Time and Space) سے آزاد حواس عارضی طور پر ہم سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق خواب اور بیداری زندگی کے دو رخ ہیں۔ یعنی انسان کی زندگی دو رخ یا دو حواس سے مرکب ہے۔ ایک کا نام دن یا بیداری ہے اور دوسرے کا نام خواب یا رات ہے۔ رات کے حواس میں ہر ذی روح مخلوق (Time and Space) سے آزاد ہو جاتی ہے۔ دن کے حواس میں ہر ذی روح مخلوق (Time and Space) کے حواس میں قید ہو جاتی ہے۔

زندگی کا قیام سانس کے اوپر ہے۔ اور سانس کے دو رخ ہیں۔ ایک رخ یہ ہے کہ سانس ہم اندر لیتے ہیں اور دوسرا رخ یہ ہے کہ سانس ہم باہر نکالتے ہیں۔ سانس کا اندر جانا ہمیں ہماری روح سے قریب کر دیتا ہے اور سانس کا باہر آنا ہمیں ان حواس سے قریب کرتا ہے جو حواس ہمیں روح کی معرفت سے دور کرتے ہیں۔ جب ہم آنکھیں بند کر کے یا کھلی آنکھوں سے کسی طرف پوری یکسوئی کے ساتھ متوجہ ہو جاتے ہیں تو سانس اندر لینے کا وقفہ زیادہ ہو جاتا ہے۔ یعنی ہماری شعوری توجہ روح کی طرف ہو جاتی ہے۔

سوال: روحانی علم کو مخفی علم یا علم سینہ کہہ کر کیوں عام نہیں کیا گیا؟

جواب: تصوف کے اوپر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں روحانی علوم کا تذکرہ تو کیا گیا لیکن اس علم کو ایک اور ایک دو، دو اور دو چار کی طرح عام نہیں کیا گیا۔ بہت سے رموز و نکات بیان کئے گئے ہیں لیکن پھر بھی بہت سے رموز و نکات پردے میں اس لئے ہیں کہ ان رموز و نکات کو وہی حضرات سمجھ سکتے ہیں جو منزل رسیدہ ہیں یا جو حضرات راہ سلوک میں سفر کر چکے ہیں۔

ہمارے اسلاف نے یہ بھی فرمایا کہ روحانی علوم چونکہ منتقل ہوتے ہیں اس لئے ان کو محفوظ رہنا چاہئے اور ان کی حفاظت کرنی چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان علوم کا نام علم سینہ رکھ دیا گیا ہے۔ ہمارے اسلاف نے یہاں

تک کہہ دیا ہے کہ روحانی علوم حاصل ہونے کے بعد ان کے نتائج (مافوق الفطرت باتوں) کو چھپالینا چاہئے۔ ایسا کیوں ہوا؟ ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسانوں کے اندر سوچنے سمجھنے اور علم حاصل کرنے کی صلاحیت اتنی موجود نہیں تھی جتنی صلاحیت آج موجود ہے۔ سائنس کے اس ترقی یافتہ دور سے پہلے دور دراز آوازوں کا پہنچنا کرامت سمجھی جاتی تھی۔ لیکن آج سائنس دانوں نے آواز کا طول موج (Wave Length) دریافت کرلیا ہے۔ خیالات کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا بھی کرامت (مافوق الفطرت) بیان کیا جاتا ہے۔ آج کی دنیا میں ہزاروں میل کے فاصلے پر پوری کی پوری تصویر منتقل ہوجاتی ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں، صرف پچاس سال پہلے لوگوں سے یہ کہا جاتا تھا کہ آدمی روشنیوں کا بنا ہوا ہے تو لوگ مذاق اڑاتے تھے۔ آج سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آدمی لہروں سے مرکب ہے۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے یہ بات بتا دی کہ آدمی لہروں سے مرکب ہے، وہ آدمی کی ایک جگہ سے گزرنے کے بعد بھی تصویر لے لیتے ہیں۔

پہلے زمانے میں دادی اور نانی بچوں کو اڑن کھٹولوں کے قصے سنایا کرتی تھیں کہ ایک اڑن کھٹولا تھا۔ اس پر ایک شہزادی اور شہزادہ بیٹھے اور اڑ گئے۔ نانی اور دادی کے وہی اڑن کھٹولے آج ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں۔ نہ صرف یہ کہ موجود ہیں بلکہ ہم اس میں بیٹھ کر اپنی مرضی اور منشا کے مطابق سفر بھی کرتے ہیں۔

ان تمام مثالوں سے یہ بتانا مقصود ہے کہ سائنس کی ترقی سے پہلے نوع انسانی کی صلاحیت اتنی نہیں تھی کہ روحانی رموز و نکات اس کی سمجھ میں آتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بزرگوں اور اسلاف نے پہلے چند لوگوں کا انتخاب کیا اور پھر ان کو وہ علوم منتقل کردیئے لیکن آج کے دور میں انسان کی دماغی صلاحیت اور سکت فہم اور تفکر اتنا زیادہ طاقتور ہے کہ جو چیزیں پہلے کشف و کرامات کے دائرے میں آتی تھیں آج وہی چیزیں انسان کی عام زندگی میں داخل ہیں۔ جیسے جیسے علوم سے انسان کی سکت بڑھتی گئی اور شعور طاقتور ہوگیا، ذہانت میں اضافہ ہوا، گہری باتوں کو سمجھنے اور جاننے کی سکت بڑھی۔ سائنس کی ترقی سے یہ بہت بڑا فائدہ ہوا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے شعور کی طاقت بڑھی اسی مناسبت سے آدمی کے اندر یقین کی طاقت کمزور ہوتی چلی گئی۔

یقین کی طاقت کمزور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اللہ سے دور ہوتا چلا گیا۔ اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ سائنس کی ترقی کا مطمح نظر زیادہ تر دنیاوی آسائش و آرام کا حصول ہے۔ چونکہ دنیا خود بے یقینی کا سمبل (Symbol) اور فکشن (Fiction) ہے اور مفروضہ حواس کے علاوہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس لئے یہ ترقی بھی ہمارے لئے عذاب بن گئی۔ اگر اس ترقی کی بنیاد ظاہر اسباب کے ساتھ ماورائی صلاحیت کی تلاش ہوتی تو یقین کمزور ہونے کے بجائے طاقتور رہتا۔ لیکن اس کے باوجود سائنسی علوم کے پھیلاؤ سے

بہر حال اتنا فائدہ ضرور ہوا ہے کہ ہمارے اندر ایسے علوم حاصل کرنے کی صلاحیت کا ذوق پیدا ہوا جو ہمیں روحانیت سے قریب کرتے ہیں۔

اب سے پچاس سال پہلے یا سو سال پہلے جو چیز پچاس پچاس، سو سو سال کی ریاضت کے بعد حاصل ہوتی تھی۔اب وہی چیز ارادے کے اندر یقین مستحکم ہونے سے چند مہینوں اور چند سالوں میں حاصل ہو جاتی ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ پر یقین رکھنے اور توکل کرنے کے کیا معانی ہیں؟

جواب: روحانی زندگی میں داخل ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی کھانا نہ کھائے، پانی نہ پئے، کپڑے نہ پہنے، اس کے دوست احباب نہ ہوں۔یہ سب اس لئے ہونا ضروری ہے کہ دنیا کو وجود بخشنے والا اس دنیا میں رونق دیکھنا چاہتا ہے۔اس دنیا کو قائم رکھنا چاہتا ہے وہ اس دنیا کو خوبصورت دیکھنا چاہتا ہے۔اسباب و وسائل جب تک دنیا میں موجود ہیں، دنیا موجود ہے، دنیا قائم ہے.........دنیا میں جو وسائل پیدا کئے گئے ہیں ان کا فائدہ بہر حال انسانوں کو پہنچتا ہے اور پہنچتا رہے گا۔

روزمرہ زندگی میں جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے وہ روزی اور رزق کا حاصل کرنا ہے اس لئے کہ رزق حاصل کئے بغیر زندگی ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔زندگی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ہمارے سامنے یہ بات موجود ہے کہ ہماری زندگی مختلف مراحل اور مختلف زمانوں سے مزین ہے۔زندگی کے قیام کا پہلا زمانہ یا مرحلہ ایسی بند کوٹھری ہے جس میں بظاہر نہ ہوا کا گزر ہے اور نہ ہی اس کوٹھری میں انسان کے اپنے ارادے اور اختیار سے کھانے پینے کی چیزیں مہیا ہوتی ہیں نہ ہی اس کوٹھری میں رہتے ہوئے وہ پانی روزی حاصل کرنے کے لئے کوئی محنت اور مشقت کرتا ہے۔لیکن اسے روزی ملتی ہے اور روزی اس کی نشوونما بھی کرتی ہے۔اس نشوونما کا دور نو مہینے کی زندگی پر مشتمل ہے۔ماں کے پیٹ میں بچہ بتدریج اور ایک توازن کے ساتھ بڑھتا رہتا ہے اور اس کی ساری غذائی ضروریات پوری ہوتی رہتی ہیں اور مہینے کے بعد مکمل آدمی کی شکل وصورت اختیار کر کے بچہ اس کوٹھری سے باہر آجاتا ہے اب بھی وہ اس قابل نہیں ہے کہ اپنی ضروریات خود پوری کر سکے۔اس کی زندگی کو نشوونما دینے کے لئے اللہ تعالیٰ ماں کے دل میں محبت ڈال دیتا ہے اور ساتھ ہی ماں کے سینے کو اس بچے کے لئے دودھ کا چشمہ بنا دیتا ہے۔بچہ بغیر کسی جدوجہد کے غذا حاصل کرتا رہتا ہے اور اس کی پرورش ہوتی رہتی ہے۔بچپن سے گزر کر لڑکپن کے زمانے میں بھی اس کو اپنی روزی حاصل کرنے کی کوئی فکر لاحق نہیں ہوتی۔اس کی تمام ضروریات کا کفیل اللہ تعالیٰ نے اس بچے کے ماں باپ کو بنا دیا ہے۔اب بچہ لڑکپن سے نکل کر شعور کی

دنیا مین داخل ہوتا ہے۔شعور کی دنیا میں یہ انقلاب برپا ہوتا ہے کہ وہ سوچتا ہے کہ مجھے روزی حاصل کرنے کے لئے کچھ کرنا ہوگا۔وہ اس تگ و دو میں اپنی پچھلی ساری زندگی کو فراموش کر دیتا ہے۔اس کے ذہن سے یہ بات نکل جاتی ہے کہ بغیر کسی جدوجہد کے بھی اللہ تعالیٰ مجھے رزق دیتے رہے ہیں۔ جوانی کے دور سے گزر کر وہ بڑھاپے میں داخل ہوتا ہے۔بڑھاپے میں بھی اس کے اعضاء اسی طرح ہو جاتے ہیں جس طرح بچپن میں تھے اور وہ اپنی معاش حاصل کرنے کے قابل نہیں رہتا۔لیکن جب تک اس کی زندگی ہے، اللہ تعالیٰ اسے روزی فراہم کرتے رہتے ہیں۔

ہمارا جوانی کے دور میں یہ سوچنا کہ ہمیں رزق ہماری محنت سے ملتا ہے۔صحیح طرز فکر کے خلاف ہے، اس لئے کہ ہماری زندگی کا تین چوتھائی بغیر محنت اور مزدوری کر کے گزرتا ہے۔محنت، مزدوری اور کوشش اس لئے کی جانی چاہئے کہ اللہ کا نظام یہ ہے کہ اللہ اس کائنات کو ہر لمحہ اور ہر آن متحرک دیکھنا چاہتا ہے۔جس طرح کہ اللہ نے ماں کے دل میں محبت پیدا کر دی اور ماں کو رزق پہنچانے کا ذریعہ بنا دیا ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ نے زمین کو اس بات کا پابند کر دیا ہے کہ وہ نوع انسان اور زمین کے اوپر آباد تمام مخلوق کو روزی فراہم کرے۔ آپ زمین میں بیج ڈالتے ہیں۔اگر زمین بیج کی نشوونما کرنے سے انکار کر دے تو دنیا ویران ہو جائے گی جب کوئی چیز پیدا ہی نہیں ہوگی تو تمام حرکت اور تمام گردشیں رک جائیں گی۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے ماں کے دل میں محبت ڈال دی اسی طرح اللہ تعالیٰ نے زمین کے دل میں بھی اپنی مخلوق کی محبت ڈال دی اور اسے پابند کر دیا کہ وہ زمین پر آباد مخلوق کی خدمت کرے۔اسی طرح چاند اور سورج کو بھی اللہ تعالیٰ نے خدمت گزاری کے لئے مسخر اور پابند کر دیا۔سوال یہ ہے کہ زمین اگر اپنا ارادہ اور اختیار استعمال کر کے گیہوں نہ اُگائے، سورج اپنی روشنی یا دھوپ سے گندم کو نہ پکارے تو آپ روٹی کیسے کھائیں گے؟اور روٹی پر ہی کیا دارومدار ہے ہر چیز کی یہی صورت ہے۔جب زمین پر کوئی چیز پیدا نہیں ہوگی تو ہم زندہ کیسے رہیں گے۔اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آدمی کو رزق اس کی ذاتی محنت کی وجہ سے نہیں ملتا، رزق پہلے سے موجود ہے۔اسے رزق حاصل کرنے کے لئے صرف حرکت کرنی پڑتی ہے۔

طرز فکر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ مجھے اس لئے حرکت کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ حرکت پسند فرماتے ہیں، اس لئے کہ ساری کائنات بجائے خود ایک حرکت ہے۔کائنات کا وجود اسی وقت زیر بحث آیا جب اللہ تعالیٰ کے ذہن نے حرکت کی یعنی اللہ تعالیٰ نے ''کن'' فرمایا۔''کن'' اللہ تعالیٰ کے ذہن کی ایک حرکت ہے اور یہ حرکت جاری و ساری ہے۔انسان کے اندر جب یقین راسخ ہو جاتا ہے تو اس کی طرز فکر یہ ہوتی ہے کہ میری ہر حرکت، میرا ہر عمل اللہ کے رحم و کرم پر قائم ہے۔وہی روزی دیتا ہے۔وہی حفاظت کرتا ہے، وہی زندہ رکھتا

ہے، وہی آفات اور بلاؤں سے محفوظ رکھتا ہے، وہی خوشی دیتا ہے۔ جب آدمی کا یقین ٹوٹ جاتا ہے تو اس کی طرز فکر ناقص ہو جاتی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ بندوں کے سہارے تلاش کرتا ہے۔ سیٹھ ناراض ہو جائے گا تو نوکری چلی جائے گی اور سیٹھ خوش ہو جائے گا تو ترقی مل جائے گی۔ نعوذ باللہ! سیٹھ کوئی بندہ نہیں، خدا بن گیا۔ جب کسی قوم کی طرز فکر بہت زیادہ گمراہ ہو جاتی ہے یعنی اللہ کے علاوہ دوسروں کا سہارا سمجھنے لگتی ہے تو ایسی قومیں زمین پر بوجھ بن جاتی ہیں اور زمین انہیں رد کر دیتی ہے۔ وہ مفلوک الحال ہو جاتی ہیں اور ان کے اوپر احساس کمتری کا عذاب مسلط ہو جاتا ہے۔ انبیاءؑ کی طرز زندگی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو ہمارے سامنے صرف ایک ہی بات آتی ہے کہ انبیاءؑ کی طرز زندگی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو ہمارے سامنے صرف ایک ہی بات آتی ہے کہ انبیاء کی طرز زندگی اور طرز فکر یہ ہے کہ وہ ہر بات، ہر عمل اور زندگی کی ہر حرکت کو اللہ کی طرف سے سمجھتے ہیں اور اللہ ہی کی طرف موڑ دیتے ہیں۔

سوال: رحمانی طرز فکر کو اپنے اندر راسخ کرنے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

جواب: کسی طرز فکر کو اپنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے اس مخصوص طرز فکر کو قبول کیا جائے۔ پھر طرز فکر والی مخصوص ہستی سے ایسا تعلق قائم کر لیا جائے جو فریقین کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دے۔ یہ تعلق اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب طرز فکر حاصل کرنے والا اس شخص کے عادات و اطوار کو اپنی عادت و اطوار بنائے اور جس شخص کی طرز فکر حاصل کرنا مقصود ہے وہ بھی دوسرے آدمی کو اپنا قرب عطا کرے۔ اور اس کو اپنی جان کا ایک حصہ سمجھے۔ تصوف میں طرز فکر حاصل کرنے کا اصطلاحی نام نسبت ہے۔ نسبت میں سب سے پہلی نسبت روحانی استاد ہے۔ یعنی روحانی استاد کے اندر کام کرنے والی طرز فکر اس کا مزاج، اس کی طبیعت اور اس کے اندر کام کرنے والی روشنیاں روحانی شاگرد کے اندر منتقل ہو جائیں۔ جب یہ روشنیاں پوری طرح منتقل ہو جاتی ہیں تو اس نسبت کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

سوال: واہمہ، خیال، تصور اور احساس میں کیا فرق ہے؟

جواب: آدمی کا ہر عمل اور زندگی کا ہر تقاضہ واہمہ، خیال، تصور اور احساس کے دائرے میں مقید ہے۔ مثلاً ہم جب کھانا کھاتے ہیں تو پہلے بھوک کا ایک ہلکا خاکہ ہمارے دماغ پر وارد ہوتا ہے۔ اس خاکے میں (Dimensions) یا نقش و نگار نہیں ہوتے۔ اس کو اصطلاحی زبان میں واہمہ کہتے ہیں۔ یہ بہت ہلکا

خاکہ جب کچھ زیادہ گہرا ہوتا ہے تو دماغ کے اوپر یہ اطلاع وارد ہوتی ہے کہ جسم اپنی انرجی اور طاقت بحال رکھنے کے لئے کس چیز کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اس صورت کو خیال کا نام دیا گیا ہے۔ خیال میں جب گہرائی واقع ہوتی ہے تو ہمیں اطلاع ملتی ہے کہ جسم کو خورد و نوش کی ضرورت ہے۔ اس نقطے پر ان تمام چیزوں کے نقوش بن جاتے ہیں جو کھانے میں کام آتی ہیں اور جس سے جسمانی نشو و نما بحال ہوتی ہے۔ اب کھانے پینے کی چیزوں کے اندر کام کرنے والی لہریں انسان کو اپنے اندر کھینچنے لگتی ہیں۔ بات ذرا لطیف ہے اور تفکر کی ضرورت ہے۔

ہم کہتے یہ ہیں کہ ہم روٹی کھاتے ہیں۔ فی الواقع بات یہ ہے کہ گندم کے اندر روشنی یا زندگی یا انرجی یا حرارت یا کشش ثقل ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے اور جب ہم اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جاتے ہیں تو ہمارے اندر کی بھوک گندم کے اندر جذب ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم گندم نہیں کھاتے، گندم ہمیں کھا جاتا ہے۔ اس کو دوسری طرح بیان کیا جائے تو اس کو اس طرح کہا جائے گا کہ گندم کے اندر کشش ثقل موجود ہے۔ کشش ثقل یا (Gravity) ہمیں کھینچ لیتی ہے۔ ہم کشش ثقل یا (Gravity) کو نہیں کھینچتے۔ جب ہمارے اندر یہ تقاضا پوری گہرائیوں کے ساتھ سرگرم عمل ہو جاتا ہے تو ہمیں بھوک کا احساس ہوتا ہے۔ احساس سے مراد یہ ہے کہ اب ہم بغیر کھانا کھائے نہیں رہ سکتے۔ اس نقطے پر کھانا مظہر بن جاتا ہے۔ اس کو آپ کوئی بھی نام دیں، کسی بھی طرح تیار کریں بہر حال وہ کھانا ہے۔

سوال: ہمارا ماحول ہمیں کس حد تک متاثر کرتا ہے؟

جواب: طبیعات یعنی روزمرہ کی زندگی، رہن سہن اور معاشرے میں رائج اخلاقی قوانین و ضوابط سے ہر شخص اپنے علم کی حدود میں واقفیت رکھتا ہے۔ طبیعات کے بعد دوسرا علم جو عام ذہن سے اوپر کے درجے کا ہے، اہل دانش نے اس کا نام نفسیات رکھا ہے۔ نفسیات میں وہ باتیں زیر بحث آتی ہیں جن پر طبیعات یا شعور کی بنیادیں قائم ہیں۔ یہ مختصر تمہید بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس صحن میں ایک دو مثالیں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ نفسیات کی دنیا میں ایک بہت بڑا مشہور واقعہ وہ یہ کہ ایک انگریز ماں کے بطن سے ایک ایسا بچہ تولد ہوا جس کے سارے نقش و نگار اور رنگ حبشی نژاد بچوں کی طرح تھا۔ ناک نقشہ موٹا، بال گھونگریالے اور رنگ سیاہ، ویسے ہی چوڑا چکلا سینہ اور مضبوط اعصاب۔ بچہ کی پیدائش کے بعد باپ نے اس حقیقت کو کہ بچہ اس کا اپنا ہے قبول نہیں کیا۔ جب معاملہ بہت زیادہ الجھ گیا اور تحقیق و تفتیش اپنی انتہا کو پہنچ گئی تو راز یہ کھلا کہ ماں حمل کے زمانے میں جس کمرے میں رہتی تھی وہاں دیوار پر ایک حبشی بچے کا فوٹو آویزاں تھا۔ بڑے بڑے نفسیات داں، دانشوروں اور ڈاکٹروں کا بورڈ بیٹھا اور باہمی صلاح مشورے اور افہام و تفہیم سے یہ بات طے پائی کہ طونگہ

اس کمرے میں ایک حبشی بچے کا فوٹو لگا ہوا ہے اور عورت حمل کے زمانے میں بچے سے فطری اور طبعی طور پر قریب رہی ہے اور بار بار حبشی بچے کو دیکھتی رہی، دیکھنے میں اتنی گہرائی پیدا ہو گئی کہ اس کی سوچ (Feeling) پیٹ میں موجود بچے کو منتقل ہو گئی۔ دوسرا تجربہ یہ کیا گیا کہ آئندہ وہ وہ جب امید سے ہوئی تو وہاں ایک بہت خوبصورت بچے کا فوٹو لگایا گیا اور تجرباتی بنیاد پر ماں کو ہدایت کی گئی کہ اس فوٹو کو زیادہ سے زیادہ دیکھا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پیدا ہونے والے بچے کے نقوش تقریباً وہی تھے جو دیوار میں لگے ہوئے فوٹو کے تھے۔

دوسری مثال اللہ تعالیٰ کے قانون کے تحت ہمارے سامنے یہ ہے کہ ہر نوع میں بچے اپنی مخصوص نوع کے نقش و نگار پر پیدا ہوتے ہیں۔ ایک بلی آدمیوں سے کتنی ہی مانوس ہو لیکن اس کی نسل بلی ہی ہوتی ہے۔ کبھی یہ نہیں دیکھا گیا کہ بکری سے گائے پیدا ہوئی ہو یا گائے سے کبوتر پیدا ہو گیا ہو۔

کہنا یہ ہے کہ شکم مادر میں ایک طرف نوعی تصورات بچے کو منتقل ہوتے ہیں اور دوسری طرف ماں کے یا باپ کے تصورات بچے کو منتقل ہوتے ہیں۔ ان تصورات میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق مقداریں معین ہیں۔ تیسویں پارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''پاک اور بلند مرتبہ ہے وہ ذات جس نے تخلیق کیا اور مقداروں کے ساتھ ہدایت بخشی۔''

یہ مقداریں ہی کسی نوع کو الگ کرتی ہیں۔ تخلیقی فارمولوں میں جب یہ معین مقداریں بکری کے رنگ و روپ میں بدلتی ہیں تو بکری بن جاتی ہے اور جب آدم کے نقش و نگار میں تبدیل ہوتی ہیں تو آدمی بن جاتا ہے۔

تیسری مثال سیدنا حضور ﷺ کی ذات اقدس کی ہے۔ حضور ﷺ کی بعثت کے بارے میں جب ہم غور کرتے ہیں تو یہ بات واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ سیدنا حضور ﷺ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہیں۔ حاصل کائنات ﷺ کو حضرت ابراہیمؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک تمام انبیائے کرام کی معین مقداریں منتقل ہوئیں۔ انبیاء کا وہ ذہن جس میں اللہ بستا ہے۔ حضور ﷺ کو بطور ورثہ کے منتقل ہوا۔ اس بات کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذہن مبارک بعثت سے پہلے ہی تمام انبیائے کرامؑ کی منازل طے کر

چکا تھا۔ یہ بہت زیادہ غور طلب ہے کہ قرآن پاک میں جتنے انبیاءؑ کا تذکرہ ہوا ہے۔تقریباً وہ سب حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہیں۔یعنی ایک نسل میں طرز فکر برابر منتقل ہوتی رہی۔اس قانون سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ روحانی دراصل ایک مخصوص طرز فکر کا نام ہے۔

نبوت ختم ہو چکی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا قانون جاری وساری ہے۔قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت میں تعطل واقع ہوتا ہے، نہ تبدیلی ہوتی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کی اس سنت کو جاری رکھنے کا پروگرام حضورﷺ نے اپنے ورثاء کو منتقل کیا۔ جو اللہ تعالیٰ کے دوست ہیں اور جن کو عرف عام اولیاء اللہ اور روحانی استا کہا جاتا ہے۔

کن فیکون

سوال: قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق سے مخاطب ہو کر کہا، کیا نہیں ہوں میں رب تمہارا؟ مخلوق نے اقرار کیا کہ بے شک آپ ہمارے رب ہیں۔ اس آیت کی روحانی تفسیر کیا ہے؟

جواب: جب کچھ نہیں تھا تو اللہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ میری عظمت اور میری ربوبیت اور میری خالقیت کا اظہار ہو۔ اللہ تعالیٰ کے ذہن میں جب یہ بات آئی کہ میری عظمت کا اظہار ہو تو یہ بات خود بخود سامنے آجاتی ہے کہ عظمت کو پہچاننے کے لئے اور اللہ تعالیٰ کو جاننے کے لئے اللہ تعالیٰ کے علاوہ بھی کوئی ایسا ذہن ہے جو اللہ تعالیٰ کی صناعی کو سمجھ اور دیکھ سکے۔

اب یہ بات اس طرح سمجھنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ میں پہچانا جاؤں۔ جیسے ہی اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ میں پہچانا جاؤں، اللہ تعالیٰ کے ذہن میں جو کچھ تھا یا ہے اس کی تخلیق کے لئے یہ ضروری تھا کہ کوئی ضابطہ و قاعدہ موجود ہو۔ اور ہر تخلیق کے جداگانہ فارمولے مرتب کئے جائیں۔ یہ ضابطے، قاعدے اور فارمولے بھی اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ذہن میں جو پروگرام تھا اس کو ''کن'' کہہ کر ظاہر فرمایا۔

جس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''کن'' تو جو کچھ اللہ تعالیٰ کے ذہن میں تھا وہ قاعدوں، ضابطوں، فارمولوں اور شکل و صورت کے ساتھ عالم وجود میں آگیا جو کچھ عالم وجود میں آگیا اس کا نام کائنات ہے۔ کائنات ایک ایسے خاندانوں کا نام ہے جس میں بے شمار نوعیں ایک کنبے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جیسے ہی کن فیکون بنا تمام نوعیں وجود میں آگئیں۔

ان نوعوں میں جنات، فرشتے، انسان، جمادات و نباتات، حیوانات، زمینیں، سماوات اور بے شمار کہکشانی نظام ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ساری نوعیں ایک کنبے کی حیثیت سے قیام پذیر ہیں۔ کوئی نوع یہ نہیں جانتی کہ میں کیا ہوں، کون ہوں، میری تخلیق کا منشاء کیا ہے؟

تخلیق کے پہلے مرحلے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جب ان تمام نوعوں کو شعور بخشا تو نظر وجود میں آئی۔ جب اللہ نے کہا، میں ہوں تمہارا رب تو کائنات میں موجود تمام نوعیں اس آواز کی طرف متوجہ ہو گئیں اور نوعوں نے دیکھا کہ اللہ ہمارا رب ہے۔ قانون یہ ہے کہ شعور اس وقت متحرک ہوتا ہے جب صاحب شعور یہ جانتا ہو کہ میری اپنی ایک ہستی ہے اور میرے علاوہ دوسری ہستی بھی ہے۔

تخلیق کا دوسرا مرحلہ یہ بنا کہ کائنات نے جیسے ہی اللہ تعالیٰ کی آواز سنی اس کے اندر شعور کی دو صلاحیتیں پیدا ہوگئیں ۔ایک سننے کی صلاحیت، دوسری دیکھنے کی صلاحیت۔مخلوق نے سننے اور دیکھنے کی صلاحیت کو استعمال کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف دیکھا تو شعور کے اندر تیسری صلاحیت 'سمجھنا' پیدا ہوگئی ۔

سننے، دیکھنے اور سمجھنے کے بعد چوتھی صلاحیت اپنے علاوہ دوسرے کو پہچاننے کی پیدا ہوگئی ۔ پہچاننے کی صلاحیت کے بعد پانچویں صلاحیت یہ پیدا ہوئی کہ نوعوں نے خود کو پہچان لیا اور یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی کہ کسی عظیم اور بابرکت ہستی نے مجھے پیدا کیا ہے اور یہ ہستی اللہ تعالیٰ کی ہستی ہے ۔

کائنات نے اس بات کا اقرار کیا کہ ''جی ہاں ،ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ آپ ہمارے رب ہیں، آپ نے ہمیں پیدا کیا ہے، اس عالم میں کائنات (انسان) نے اللہ کو دیکھ لیا اور پہچان لیا ۔

سوال: تصوف میں بیان کردہ لوح اول اور لوح دوئم کیا ہیں؟

جواب: جس طرح اللہ تعالیٰ کے ذہن میں ساری کائنات موجود تھی اور ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ذہن میں کائنات کی موجودگی مظہر بن گئی ۔اس عالم میں موجود کوئی نوع جب اپنی ہستی کے اندر دیکھتی ہے تو اسے پوری کائنات نظر آتی ہے ۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس عالم میں جو نظر کام کر رہی ہے وہ نظر اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود کائنات کے عکس کو دیکھ رہی ہے ۔اس عالم کا نام لوح محفوظ ہے ۔لوح محفوظ پر کائنات کے نقش و نگار (Display) ہوتے ہیں تو ہر نوع الگ الگ خود کا مشاہدہ کرتی ہے ۔اس عالم کا نام لوح دوئم ہے ۔

اسی بات کو بہت آسان اور عام فہم زبان میں مثال سے بیان کیا جاتا ہے ۔اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی موجود نہیں ہے ۔اللہ تعالیٰ کے ذہن میں ایک پروگرام یا ڈرامہ ہے ۔اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اس ڈرامے کو اسٹیج کیا جائے ۔ جیسے ہی اللہ تعالیٰ نے ارادے کے ساتھ 'کن' فرمایا ڈرامے کے سارے کردار موجود ہو گئے لیکن ابھی ان کرداروں کو یہ پتہ نہیں ہے کہ ہمارے ذمے کون سا کام ہے یا اس ڈرامے میں ہماری کیا حیثیت ہے ۔اللہ تعالیٰ نے تمام کرداروں کو یہ بتایا کہ تمہاری یہ ڈیوٹی ہے، تمہارا یہ کام ہے ۔جب یہ کردار خود سے واقف ہو گئے تو ان کے سامنے وہ عظیم ہستی آگئی جس نے ڈرامے کو اسٹیج کیا تھا ۔جس عالم میں کائنات کے نقش و نگار بنے ہوئے ہیں وہ لوح محفوظ ہے اور جس عالم میں لوح محفوظ پر بنے ہوئے نقش و نگار (Display) ہو رہے ہیں وہ لوح دوئم ہے ۔

سوال: علم حقیقت کیا ہے؟

جواب: جب ہم علم کی ہیئت، اصلیت اور حقیقت پر غور کرتے ہیں تو ہمارے پاس یہ کہے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ علم کی بنیاد دراصل کسی چیز کی خبر یا کسی چیز کی شکل وصورت کو یا کسی چیز کے وصف کو جاننا ہے۔ علم کے معنی بھی یہی ہیں کہ آدمی کے اندر جاننے اور کسی چیز سے واقف ہو جانے کا عمل پیدا ہو جائے۔ جب تک ہمیں کسی چیز کے بارے میں علم حاصل نہیں ہوتا اس وقت تک وہ چیز ہمارے لئے معدوم کی حیثیت رکھتی ہے۔

جاننے کی تین طرزیں ہیں۔ ایک جاننا یہ ہے کہ ہمیں کسی چیز کی اطلاع فراہم کی جائے اور ہم اس اطلاع کو یقین کے درجے میں قبول کرلیں۔ علم کی دوسری قسم یہ ہے کہ ہم کسی چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور علم کی تیسری قسم یہ ہے کہ ہم دیکھی ہوئی چیز کے اندر صفات کو نہ صرف یہ کہ محسوس کرلیں بلکہ اس کا باطنی آنکھ سے مشاہدہ بھی کرلیں۔

اس علم کو روحانی سائنس دانوں نے تین درجوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ علم الیقین

۲۔ عین الیقین

۳۔ حق الیقین

علم الیقین یہ ہے کہ ہمیں اس بات کی اطلاع ملی کہ سائنس دانوں نے ایک ایسا ایٹم بم ایجاد کیا ہے جو ایک لمحہ میں لاکھوں جانیں ہلاک کرسکتا ہے۔ حالانکہ ہم نے ایٹم بم دیکھا نہیں ہے لیکن ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ ایٹم بم موجود ہے۔ علم کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ ہمیں پہلے اطلاع ملی کہ ایک ایسی مشین ایجاد ہوئی ہے کہ ہزاروں میل دور تصویریں اس مشین کی مدد سے اسکرین پر نمودار ہو کر نظر آتی ہیں۔ چونکہ ہم ہزاروں میل کے فاصلے سے چلی ہوئی تصویریں ٹی وی پر منعکس دیکھ لیتے ہیں لہٰذا اس علم کا نام عین الیقین ہوگا۔ ہمیں یہ اطلاع فراہم کی گئی کہ کائنات کی بنیاد اور کائنات کی بساط میں جو کچھ موجود ہے وہ دراصل روشنیوں سے بنا ہوا ہے۔ چونکہ وہ روشنیاں ہمارے سامنے نہیں ہیں اور نہ ہی ان روشنیوں کی ماہیت سے ہم واقف ہیں۔ اس لئے ہم یہ کہیں گے کہ ہمیں حق الیقین حاصل نہیں ہے۔ اسے ہم مختصر طریقہ سے اس طرح بھی بیان کرسکتے ہیں کہ کسی نے کہا آگ جل رہی ہے۔ ہم نے اس کے کہنے پر یقین کرلیا کہ وہاں آگ ہے۔ اسے علم الیقین کہیں گے۔ جب ہم آگ کے قریب گئے اور اسے دیکھ لیا تو ہمیں عین الیقین حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد ہم نے آگ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو تپش محسوس کی۔ اس تجربے کا نام حق الیقین ہے۔

روحانی انسان جب کسی علم کا تذکرہ کرتا ہے یا کائنات میں موجود کسی شئے کا تجزیہ کرتا ہے تو اس کے سامنے علم کے یہ تینوں درجے ہوتے ہیں۔ روحانی سائنس بتاتی ہے کہ انسان کو اگر کوئی چیز دوسری مخلوق سے

ممتاز کرتی ہے تو وہ علم ہے، ایسا علم جو اللہ تعالیٰ نے آدم کے لئے مخصوص کر دیا ہے اور کسی دوسری نوع کو یہ علم عطا نہیں کیا۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے آدم کو نیابت اور علوم کا تذکرہ کیا ہے اس آیت میں تفکر کرنے سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ علوم فرشتوں کو بھی حاصل ہیں اور علوم آدم کو بھی حاصل ہیں۔ لیکن آدم کو وہ مخصوص علوم حاصل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بھی نہیں سکھائے۔ فرشتے کہتے ہیں کہ ہم آپ کی پاکی بیان کرتے ہیں اور ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا علم آپ نے ہمیں عطا کر دیا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ انسان کا شرف دراصل اس کا علم ہے اور یہ وہ علم ہے جو دوسری مخلوقات کو حاصل نہیں ہے۔

ایک چڑیا زندگی گزارنے کے سارے تقاضے رکھتی ہے اور ان تقاضوں کو پورا کرنے کے علم سے بھی باخبر ہے لیکن وہ ہوائی جہاز نہیں بنا سکتی، ایٹم بم نہیں بنا سکتی، ریڈیو یا ٹی وی نہیں ایجاد کر سکتی اور آدمی یہ تمام چیزیں بنا لیتا ہے اور اس کے علاوہ نئی نئی اختراعات کرتا رہتا ہے۔ اس علم کو ہم وہ علم نہیں کہتے جو علم اللہ تعالیٰ نے بطور خاص آدم کے لئے مخصوص کیا ہے۔ اس لئے کہ اس علم کا تعلق عقل سے ہے یا یہ بالفاظ دیگر عقل نئی نئی ایجادات تخلیق کرتی ہے۔ جس طرح ایک آدمی ٹی وی بنا لیتا ہے اور چڑیا ٹی وی نہیں بنا سکتی۔ اسی طرح چڑیا آسمان کی وسعتوں میں اڑتی ہے جب کہ آدمی اڑ نہیں سکتا۔ آدم زاد میں بھی سب لوگ ایسے عاقل، بالغ اور باشعور نہیں ہوتے کہ جن سے ایجادات ظہور میں آتی ہوں۔ عقل کی کمی یا زیادتی کی بنیاد پر اختراعات کا وجود قائم ہے۔ لیکن ایک علم ایسا ہے جو عقل کی حدود اور دائرے سے باہر ہے۔ مثلاً یہ کہ ایک بندہ چڑیا کی طرح اڑ سکتا ہے۔ اولیائے کرام کے ایسے بے شمار واقعات تاریخ کے صفحات میں موجود ہیں کہ انہوں نے فضا میں پرواز کی ہے۔ ہزاروں میل دور کی چیز کو بغیر کسی دوربین کے دیکھ لیا ہے، لاکھوں سال پہلے کی آوازوں کو سنا ہے، سمجھا ہے اور یہ سب کچھ ظاہری وسائل کے بغیر ہوا ہے۔ عقل سے جو علم سیکھا جاتا ہے اس کا نام علم حصولی ہے اور جو علم وجدان سے حاصل ہوتا ہے اس کا نام علم حضوری ہے۔

سوال: علم حصولی اور علم حضوری سے کیا مراد ہے؟

جواب: علم کی دو طرزیں متعین ہیں۔ ایک طرز علم حضوری اور علم کی دوسری طرز کو روحانی سائنس میں اکتساب کہتے ہیں یعنی ایسا علم جو عقل کے استعمال سے سیکھ لیا جائے۔ جتنا زیادہ عقل کا استعمال ہوگا اس ہی مناسبت سے اس علم میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ علم حصولی ایک ایسا علم ہے کہ آدمی اپنی کوشش، محنت، جدوجہد اور صلاحیتوں کے مطابق ظاہر اسباب میں رہ کر کوئی علم سیکھے اور اس علم میں مادی وسائل بروئے کار آئیں۔ اکتسابی علوم آدمی کو اپنی ذہنی صلاحیتوں کے مطابق اور عقل کے استعمال کے ذریعے بتدریج حاصل ہوتے رہتے

ہیں۔یعنی جس علم میں جتنی زیادہ عقل استعمال کیا جائے اسی مناسبت سے یہ علم اس بندے کے لئے روشنی بنتا چلا جائے گا۔بات اس میں عقل کے استعمال کی ہے۔عقل بندر میں بھی ہوتی ہے، عقل انسان میں بھی ہے۔بندر کی عقل کے مطابق اسے علوم سکھائے جائیں وہ بھی سیکھ لیتا ہے۔ایک آدمی لوہار بننا چاہتا ہے۔اس کے سامنے تین چیزیں ہیں۔ایک لوہا، دوسری وہ صلاحیت جو لوہے کو مختلف شکلوں میں ڈھالتی ہے اور تیسری صلاحیت کا استعمال۔اب وہ صلاحیت کو استعمال کرتا ہے تو صلاحیت کے مطابق لوہے سے بے شمار چیزیں بنتی چلی جاتی ہیں۔

کسی علم کو سیکھنے کے لئے (Common Factor) نیت ہے یعنی وہ علم کس لئے سیکھا جا رہا ہے۔ اس علم کی بدولت جو چیزیں تخلیق پا رہی ہیں ان چیزوں میں تخرب کا پہلو نمایاں ہے یا اس کے اندر تعمیر پنہاں ہے۔لوہا ایک دھات ہے۔لوہے کو مختلف چیزوں میں ڈھال دینا ایک صلاحیت ہے لیکن یہ چیزیں کس مقصد اور کس کام کے لئے بنائی گئی ہیں یہ بات تعمیری یا تخریبی پہلو ظاہر کرتی ہے۔لوہے سے ایسی چیزیں بھی بنتی ہیں جن کے اوپر انسان کی فلاح و بہبود کا دارومدار ہے مثلاً چمٹا، پھونکنی، توا، ریل کے پہیے، ریل کے ڈبے، ہوائی جہاز اور دوسری بے شمار چیزیں۔اگر اگر نیت میں تخریب ہے تو یہی لوہا راکٹ اور بم وغیرہ میں تبدیل ہو کر نوع انسانی کی تباہی کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔

علم حصولی ایک ایسا علم ہے جو وسائل کے یقین کے ساتھ سکھایا جاتا ہے۔وسائل ہوں گے تو یہ علم سیکھا جا سکتا ہے۔وسائل نہیں ہونگے تو یہ علم نہیں سیکھا جا سکتا۔قلم ہو گا تو تحریر کاغذ پر منتقل ہو گی۔قلم نہیں ہو گا تو تحریر کاغذ پر منتقل نہیں ہو گی۔مطلب یہ ہے کہ قلم وسیلہ ہے اس بات کے لئے کہ تحریر کو کاغذ پر منتقل کیا جائے۔علم حصولی کے لئے وسائل کے ساتھ ساتھ استاد کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔ایسا استاد جو گوشت پوست سے مرکب ہو جو زمان و مکان میں بند جسمانی خدوخال کے ساتھ شاگرد کے سامنے ہو نیز استاد یہ بتانے کے لئے موجود ہو کہ قلم اس طرح پکڑا جاتا ہے اور قلم سے الف، ب، ت، اس طرح لکھی جاتی ہے۔

علم حضوری وہ علم ہے جو ہمیں غیب کی دنیا میں داخل کر کے غیب کی دنیا سے متعارف کراتا ہے۔یہ وہ علم ہے جس کی حیثیت براہ راست ایک اطلاع کی ہے۔یعنی علم حضوری سیکھنے والے بندے کے اندر لاشعوری تحریکات عمل میں آجاتی ہیں۔لاشعوری تحریکات عمل میں آنے سے مراد یہ ہے کہ حافظے کے اوپر ایک نقش ابھرتا ہے مثلاً اگر علم حضوری سکھانے والا کوئی استاد کبوتر کہتا ہے تو حافظے کی سطح پر یا ذہن کی اسکرین پر کبوتر کا ایک خاکہ سا بنتا ہے اور جب الفاظ کے اندر گہرائی پیدا ہوتی ہے تو دماغ کے اندرونی واقع کبوتر اپنے پورے خدوخال کے ساتھ بیٹھا ہوا نظر آ جاتا ہے۔اسی طرح جب استاد کسی سیارے یا ستارے کا تذکرہ کرتا ہے تو حافظے کی اسکرین پر

روشن اور دمکتا ہوا ستارہ محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح روحانی استاد جب جنت کا تذکرہ کرتا ہے تو جنت سے متعلق ایک فلم دماغ کے اندر ڈسپلے ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ ذہن کے اندر یہ بات ہمیں نقش نظر آتی ہے کہ جنت ایک ایسا باغ ہے جس میں خوبصورت پھول ہیں، آبشاریں ہیں، دودھ کی طرح سفید پانی کی نہریں ہیں اور وہاں ایسے خوبصورت مناظر ہیں جن کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔

علم حضوری ایک ایسا علم ہے جو مادی وسائل کا محتاج نہیں ہے۔ اس علم کو سیکھنے کے لئے کاغذ، قلم، دوات کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ جس طرح حصولی علم کو سیکھنے کے لئے استاد کی ضرورت پیش آتی ہے اسی طرح حضوری علم کو سیکھنے کے لئے روحانی استاد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ علم ٹائم اور اسپیس کی حدود سے باہر ہے۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ استاد مادی خدوخال اور دوسری مادی وسائل کے ساتھ بھی شاگرد کے سامنے موجود ہو۔ علم کے طالب کو شاگرد کہا جاتا ہے اور علم سکھانے والے کو استاد کا نام دیا جاتا ہے۔ علم حضوری سیکھنے والے طالب علم کا اصطلاحی نام مرید ہے اور علم حضوری سکھانے والے کا اصطلاحی نام مراد ہے۔

علم حضوری میں استاد کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ طالب علم کو صلاحیتوں کا استعمال سکھا دے۔ اک آدمی تصویر بنانا چاہتا ہے یا تصویر بنانے کا فن سیکھنا چاہتا ہے۔ استاد کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ شاگرد کو یہ بتا دے کہ تصویر اس طرح بنتی ہے کہ اگر گراف کے اتنے خانے کاٹ دیئے جائیں تو ناک بن جائے گی۔ گراف کے اتنے خانوں پر پینسل پھیر دی جائے تو کان بن جائے گا۔ گراف کے اندر اتنی تعداد میں خانے کاٹ دیئے جائیں تو آنکھیں بن جائیں گی۔ پینسل کو اس زاویے سے گھما دیا جائے تو چہرہ بن جائے گا۔ طالب علم استاد کے بتائے ہوئے اس طریقے پر عمل کرتا ہے تو وہ تصویر بنا لیتا ہے۔ لیکن یہ تصویر اس کی اپنی صلاحیتوں کا اظہار ہوتی ہے۔ استاد کا کام صرف اتنا تھا کہ اس نے تصویر بنانے کا قاعدہ سمجھا دیا۔ جتنی مشق کی جاتی ہے اسی مناسبت سے تصویر کے خدوخال بہتر اور خوبصورت ہوتے جاتے ہیں۔

اس کے متضاد علم حضوری میں مراد مرید کے اندر اپنی صلاحیتیں منتقل کر دیتا ہے مرید جب تصویر کشی کر لے گا تو اس تصویر میں مراد کی صلاحیت کا عکس نمایاں ہو گا۔ صلاحیتوں کا منتقل کرنا مادی وسائل کا محتاج نہیں ہے۔ صلاحیتوں کو قبول کرنے کے لئے اور مراد کی طرز فکر اپنے اندر منتقل کرنے کے لئے صرف اور صرف ایک بات کی ضرورت ہے وہ یہ کہ مرید خود کو اپنی تمام ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ مراد کے سپرد کر دے اور اپنی ذات کی اس طرح نفی کر دے کہ اس کے اندر بجز مراد کے کوئی چیز نظر نہ آئے۔ جیسے جیسے یہ طرز مرید کے اندر مستحکم ہوتی رہتی ہے اسی مناسبت سے مراد کی طرز فکر مرید کے اندر منتقل ہوتی رہتی ہے۔

حضرت اویس قرنیؓ اور سیدنا حضور اکرم ﷺ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ حضرت اویس قرنیؓ سیدنا

حضور اکرم ﷺ سے کبھی نہیں ملے لیکن محبت اور قربت کا یہ عالم تھا کہ حضور اکرم ﷺ شام کی طرف رخ فرماتے تھے تو چہرہ مبارک خوشی سے تمتما جاتا تھا۔اور فرماتے تھے شام سے مجھے بوئے دوست آتی ہے۔

آدمی کے اندر دماغ دراصل ایک اسکرین ہے بالکل ٹی وی کی طرح۔ کہیں سے کوئی چیز نشر ہوتی ہے۔ہزاروں میل کے فاصلے سے بغیر کسی وقت کے وہ تصویر ٹی وی اسکرین پر منتقل ہو جاتی ہے۔وہ تصویر منتی ہے، وہ تصویر بولتی بھی ہے، وہ تصویر ہنستی بھی ہے، وہ تصویر روتی بھی ہے حالانکہ یہ علم حصولی ہے کہ لوگوں نے وسائل کو کام میں لا کر اتنی زیادہ کوشش کی کہ ہزاروں میل کے فاصلے سے انہوں نے آدمی کو لہروں میں تبدیل کر کے دور دراز علاقوں میں منتقل کر دیا یہی نہیں ہے کہ ایک تصویر صرف ایک جگہ نظر آئے بلکہ ٹی وی اسٹیشن سے نکلی ہوئی ایک تصویر ہزاروں لاکھوں جگہ بیک وقت نظر آتی ہے۔

اسی طرح جب کوئی مراد اپنے مرید کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کے اندر ٹائم اور اسپیس کو حذف کرنے والی صلاحیتیں مرید کے دماغ کے اسکرین پر منتقل ہو جاتی ہیں اور جیسے جیسے یہ صلاحیتیں منتقل اور متحرک ہوتی رہتی ہیں، مرید کے اندر ذہنی تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔انتہا یہ ہے کہ مرید کی طرز فکر مراد کی طرز فکر بن جاتی ہے۔مراد کی صلاحیتیں مرید کی صلاحیتیں بن جاتی ہیں۔اور جب یہ عمل اپنے عروج پر پہنچتا ہے۔تو مراد اور مرید ایک ہو جاتے ہیں۔یہاں تک کہ دونوں کی گفتگو ایک ہو جاتی ہے، دونوں کی شکل وصورت ایک ہو جاتی ہے، دونوں کا طرز کلام ایک ہو جاتا ہے۔ایسے بے شمار واقعات تاریخ کے صفحات میں موجود ہیں کہ مراد کے سر میں درد ہوا تو مرید نے بھی اسی طرح درد کی کسک محسوس کی اور اپنی باندھ لی۔مراد کو بخار رہا تو مرید بھی بخار میں تپنے لگا۔جب کہ مرید اور مراد دونوں کے درمیان فاصلہ سینکڑوں اور ہزاروں میل تھا۔جب تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا دونوں ایک ہی وقت بخار میں مبتلا ہوئے۔اگر مرید کے اندر جذبۂ صادق ہے اور مراد سے عشق کے درجے میں محبت کرتا ہے، اپنی ذات کی نفی کر کے سب کچھ مراد کو سمجھتا ہے تو پھر دور دراز کے فاصلے معدوم ہو جاتے ہیں اور مرید ہزاروں میل دور بیٹھ کر بھی اپنے مراد اور پیرو مرشد سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔

ایسا صرف علم حضوری ہی کی صورت میں ہو سکتا ہے۔یہ علم منتقل ہوتا ہے سکھایا نہیں جاتا۔علم حصولی اور علم حضوری میں یہی بنیادی فرق ہے۔مرید یا شاگرد دونوں طریقوں سے یہ علم سیکھتا ہے مگر علم حصولی میں مرید یا شاگرد کو اپنی صلاحیتوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے، جب کہ علم حضوری میں مراد اپنی صلاحیتوں مرید کی روح کے اندر انڈیل دیتا ہے۔

سوال: روح کیا ہے اس کو تفصیل سے بیان کریں۔

جواب: قرآن پاک میں بیان کیا گیا ہے۔ ''اے رسول ﷺ! تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے امر سے ہے۔''

قرآن پاک کی آیات میں یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ انسان نا قابل تذکرہ شئے تھا۔ ہم نے اس کے اندر اپنی روح ڈال دی ہے۔ یہ بولتا، سنتا، سمجھتا، محسوس کرتا انسان بن گیا۔ بات سیدھی اور صاف ہے کہ انسان گوشت پوست اور ہڈیوں کے ڈھانچے کے اعتبار سے نا قابل تذکرہ شئے ہے۔ اس کے اندر اللہ کی پھونکی ہوئی روح نے اس کی تمام صلاحیتوں اور زندگی کے تمام اعمال و حرکات کو متحرک کیا ہوا ہے۔ ہم روزمرہ دیکھتے ہیں کہ جب کوئی مر جاتا ہے تو اس کا پورا جسم موجود ہونے کے باوجود اس کی حرکت ختم ہو جاتی ہے۔ یعنی حرکت تابع ہے، روح کے۔ درحقیقت روح زندگی ہے اور روح کے اوپر ہی تمام اعمال و حرکات کا انحصار ہے۔ روح کی ہر حرکت میں مقداریں کام کرتی ہیں اور یہ معین مقداریں استعمال کر کے روح مختلف ہیئتوں اور رنگ و روپ میں اپنا تعارف پیش کرتی ہے۔ روح جب ان معین مقداروں کے تانے بانے کے ساتھ لباس تیار کرتی ہے۔ جس کو ہم درخت کہتے ہیں۔ تو روح ہمیں درخت کی شکل میں نظر آتی ہے اور روح جب وہ مقداریں پیش کرتی ہے تو بکری میں ہوتی ہیں تو وہ ہمیں بکری نظر آتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اس طرح جتنی نوعیں اور ان نوعوں کی شکل وصورت ہم دیکھتے ہیں یا ایسی نوع جو ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے۔ وہ روح کے لباس کی ہر لمحہ بدلتی ہوئی تصویریں ہیں۔ روح جب ملاءِ اعلیٰ کے لباس میں خود کو پیش کرتی ہے تو ملاءِ اعلیٰ ہے۔ ملاءِ اعلیٰ میں گروہ جبرئیل، میکائیل اور اسرافیل شامل ہیں۔ روح ہی کی تخلیق حاملانِ عرش، ملائکہ سماوی، ملائکہ ارضی اور ایسے سیارے ہیں جن میں اربوں کھربوں انسان، جنات اور دوسری مخلوق آباد ہیں۔

روح ہمیشہ پردے میں رہتی ہے اور خود کو کسی نہ کسی لباس یا حجاب میں ظاہر کرتی ہے۔ روح کے بارے میں جتنے تذکرے ملتے ہیں اور جن لوگوں نے روح کی تعریف بیان کی ہے انہوں نے روح کو کسی نہ کسی شکل وصورت میں بیان کیا ہے مثلاً روشنی، نور وغیرہ وغیرہ۔ روشنی بھی ایک شکل ہے اور نور کی بھی ایک تعریف ہے۔ فی الواقع روح کیا ہے، اس کی ماہیت کیا ہے اس کو واضح طور پر بیان کرنے کے لئے ہمارے پاس الفاظ (Vacublary) نہیں ہیں۔

روح جس نوع کا لباس اختیار کرتی ہے اس نوع کو زندہ رہنے کے لئے تمام ضروری حواس بخشتی ہے۔ یہ حواس ہی ہیں جو الگ الگ مقدار رکھتے ہیں۔ زمان و مکان کا روپ دھار کر ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ حواس ذیلی تخلیق ہیں یعنی روح کی تخلیق۔ اس طرح جیسے انسان ہوائی جہاز بناتا ہے تو کہا یہ جاتا ہے کہ انسان ہوائی جہاز کا خالق ہے حالانکہ ہوائی جہاز کی تخلیق میں درجہ بدرجہ تمام تحریکات موجود ہیں جو روح سے

انسان کو منتقل ہوئی ہیں۔

جب کوئی انسان تخلیقی مقداروں سے آزاد ہو جاتا ہے اور اس حد تک آزاد ہو جاتا ہے کہ روح کا بنایا ہوا لباس یا اپنے لئے روح کے متعین کردہ میڈیم کی نفی ہو جاتی ہے تو وہ ایک حد تک جتنا اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں روح سے وقوف حاصل کر لیتا ہے اور یہ وقوف انسان کو تمام فاصلوں اور تمام حد بندیوں سے گزار کر دیتا ہے۔

اس دنیا کی تمام چیزیں جو کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں یا جن چیزوں کو ہم دیکھ رہے ہیں، بشمول سورج، چاند، ستارے ہم روح کی معرفت دیکھ رہے ہیں۔یعنی روح کی اطلاعات یا روح کا علم مختلف شکل و صورت اور مختلف لباسوں میں نظر آ رہا ہے۔جس طرح انسان کے اندر روح کام کر رہی ہے یا جس طرح روح نے انسان کو لباس بنا کر خود کے سامنے اور دوسری نوعوں کے سامنے پیش کیا ہے۔اسی طرح چاند اور سورج بھی ایک علم ہے جس کی اطلاع متواتر اور مسلسل روح ہمیں بہم پہنچا رہی ہے۔ایک اندھا آدمی جو چاند، سورج اور ستاروں کو نہیں دیکھ سکتا مگر چاند کی روشنی، ستاروں کی ٹھنڈک اور سورج کی تپش سے اسی طرح متاثر ہوتا ہے جیسے آنکھ رکھنے والا کوئی انسان متاثر ہوتا ہے۔بہت زیادہ سوچنے کی بات ہے کہ اندھے کو یہ نظر نہیں آ رہا ہے کہ یہ دھوپ ہے لیکن وہ دھوپ کی تپش محسوس کرتا ہے اور اسے یہ علم ہے کہ یہ دھوپ ہے ایک آدمی پانی کو دیکھتا ہے۔اس نے ابھی پانی میں ہاتھ نہیں ڈالا۔اس کا ہاتھ ابھی بھیگا بھی نہیں، ہاتھ بھیگنے سے دماغ پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ اثرات بھی مرتب نہیں ہوئے لیکن وہ پانی کو دیکھ کر پانی کہہ دیتا ہے۔ایک آدمی کی آنکھیں بند ہیں، کوئی شخص اس کے ہاتھ پر لوہے کو ٹکڑا رکھ دیتا ہے۔وہ آدمی دیکھ نہیں رہا کہ ان کے ہاتھ پر لوہا رکھا ہوا ہے لیکن وہ جانتا ہے کہ یہ لوہے کا ٹکڑا ہے۔سوال یہ ہے کہ جب پانی میں ہاتھ بھیگا ہے کو دیکھا نہیں تو اس نے یہ کیسے کہہ دیا کہ یہ پانی ہے، یہ لوہا ہے۔زبان سے ادا نہ ہونے کے باوجود محبت بھری نظروں کے اثرات خوش کن ہوتے ہیں اور غضبناک نظریں ہراساں کر دیتی ہیں۔گونگے بہرے آپس میں باتیں کرتے ہیں۔وہ ان اشاروں کو جو وہ الفاظ کی جگہ استعمال کرتے ہیں آپس میں اس طرح سمجھتے ہیں جس طرح ہم کسی بات کو الفاظ میں کہتے اور سمجھتے ہیں۔

اب ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ روح کے لئے الفاظ اس وقت اہمیت رکھتے ہیں جب وہ خیال کو الفاظ کے اندر بند کر کے اس کی ایک شکل وصورت بنا دے یا خیالات کو لباس پہنا دے۔اگر وہ علم کو الفاظ کے جامے سے آزاد رکھے تب بھی ہم مفہوم سمجھنے پر اسی طرح قدرت رکھتے ہیں جس طرح لفظ اور آواز سن کر سمجھتے ہیں۔

انسان اور آدمی

جب ہم اپنی زمین، چاند، سورج، کہکشانی نظام اور کائنات کی ساخت پر غور کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ سارا نظام ایک قاعدے، ضابطے اور قانون کے تحت کام کر رہا ہے۔ اور یہ قانون اور ضابطہ ایسا مضبوط اور مستحکم ہے کہ کائنات میں موجود کوئی شئے اپنے ضابطہ اور قاعدہ سے ایک انچ کے ہزارویں حصہ میں بھی اپنا رشتہ منقطع نہیں کرسکتی۔ زمین اپنی مخصوص رفتار سے محوری اور طولانی گردش کر رہی ہے۔ اس کو اپنے مدار پر حرکت کرنے کے لئے بھی ایک مخصوص رفتار اور گردش کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس میں ذرہ برابر فرق نہیں ہوتا۔ پانی کا بہنا، بخارات بن کر اڑنا، شدید ٹکراؤ سے اس کے مالیکیولز کا ٹوٹنا اور بجلی کا پیدا ہونا اور ماحول کو منور کرنا، حرارت کا وجود میں آنا اور ہر شئے کا دوسری شئے پر اثر انداز ہونا، یہ سب ایک مقررہ قاعدہ اور ضابطہ کے تحت ہے۔ اسی طرح حیوانات، نباتات کی پیدائش اور افزائش بھی ایک لگے بندھے قانون کی پیروی کر رہی ہے۔ انسانی دنیا میں بھی پیدائش اور نشوونما کا نظام ایک ہی چلا آرہا ہے۔ وہ پیدا ہو کر بڑھتا ہے اور لڑکپن اور جوانی کے زمانوں سے گزر کر بڑھاپے کے دور میں داخل ہو جاتا ہے اور پھر اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ کوئی یہ نہیں چاہتا کہ وہ بوڑھا ہو۔ لیکن پھر بھی وہ بوڑھا ہونے پر مجبور ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں پسند کرتا کہ اس کے اوپر موت وارد ہو لیکن دنیا میں ایک مثال بھی ایسی موجود نہیں ہے کہ آدمی نے موت سے نجات حاصل کر لی ہو۔ ان تمام باتوں پر گہرے غور وخوض کے بعد یہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ اس قدر منظم ومربوط نظام کو چلانے والی کوئی ہستی ہے۔

کئی اسے بھگوان کہتا ہے، کوئی اس لازوال ہستی کا نام (GOD) رکھتا ہے، کسی مذہبی صحیفے میں اسے یزداں کے نام سے پکارا گیا ہے۔ ایل اور ایلیا کے ناموں سے بھی یہ ہستی متعارف ہے۔ نام کچھ بھی ہو، بہر حال ہم یہ ماننے اور یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ ایک طاقتور اور لامتناہی ہستی ہمیں سنبھالے ہوئے ہے اور ساری کائنات پر اسی کی حکمرانی ہے۔ وہ لوگ جو اس عظیم ہستی کا اقرار نہیں کرتے وہ زندگی کی شکست وریخت کا ذمہ نیچر کو قرار دیتے ہیں۔ درحقیقت ان کے انکار میں بھی اقرار کا پہلو نمایاں ہے۔ اس لئے کہ جب تک کوئی چیز موجود نہیں ہوتی اس کا انکار اور اقرار زیر بحث ہی نہیں آتا، انکار کو ہم اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ کوئی بندہ اپنی دانست میں غیر متعارف ہستی کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور جب اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تو اس کا ذہن انکار کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

خالق کائنات نے یہ کائنات حق پر پیدا کی ہے ہر شئے کو کسی نہ کسی پروگرام کے ساتھ تخلیق کیا ہے۔ بلامقصد یا کھیل کے طور پر کوئی چیز وجود میں نہیں لائی گئی ہے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ انسان کیا ہے؟ عام طور پر

انسان سمجھتا ہے کہ اس کا وجود محض گوشت پوست اور ہڈیوں سے مرکب جسم ہے۔ اس کی تمام دلچسپیاں، تمام توجہ اسی جسم پر مرکوز رہتی ہے اور وہ اپنی تمام تر توانائی اس جسم کو پروان چڑھانے اور آسائش بہم پہنچانے میں استعمال کرتا ہے۔ جب کہ تمام پیغمبروں اور برگزیدہ ہستیوں نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ اصل انسان گوشت پوست کا جسم نہیں ہے بلکہ اصل انسان وہ ہے جو اس جسم کو متحرک رکھتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اس اصل انسان کو روح کا نام دیا جاتا ہے۔ اس بات کو حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے اپنی کتاب ''لوح وقلم'' میں جس طرح بیان کیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ:

''ہم اپنے مادی جسم کی حفاظت کے لئے لباس بناتے ہیں۔ لباس خواہ اونی ہو، سوتی ہو، نائیلون کے تاروں سے بنا ہو یا ریشم سے بُنا ہوا ہو جب تک گوشت پوست کے جسم پر موجود ہے اس میں حرکت ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی آدمی ہاتھ ہلائے اور قمیض کی آستین نہ ہلے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ قمیض کو چارپائی پر ڈال دیا جائے اور اس سے کہا جائے کہ وہ اپنے ارادے سے آستین ہلائے اور آستین میں حرکت پیدا ہو جائے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ لباس کی حرکت جسم کے تابع ہے۔ لباس میں اپنی ذاتی کوئی حرکت واقع نہیں ہوتی۔ اسی طرح جب روح آدمی سے بے تعلق ہو جاتی ہے اور آدمی مر جاتا ہے تو کپڑے سے بنے ہوئے لباس کی طرح اس کے اندر بھی کوئی ذاتی حرکت یا قوت مدافعت موجود نہیں رہتی۔ گوشت پوست اور رگ پٹھوں سے بنے ہوئے مادی جسم یا لباس پر ضرب لگائی جائے یا اس کو کسی تیز دھار آلے سے کاٹا جائے، جسمانی لباس کوئی حرکت نہیں کرے گا۔ جب تک روح اس لباس کو پہنے ہوئے تھی، اس لباس میں حرکت اور قوت مدافعت موجود تھی۔ پس ثابت ہوا کہ ہم گوشت پوست کے جس انسان کو اصل انسان کہتے ہیں وہ اصل انسان نہیں ہے بلکہ اصل انسان کا لباس ہے اور اصل انسان روح ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں:

''انسان ناقابل تذکرہ شئے تھا۔ ہم نے اس کے اندر اپنی روح ڈال دی۔ اور یہ دیکھتا، سنتا اور محسوس کرتا انسان بن گیا۔''

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فرمایا:

''یہ لوگ تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے امر سے ہے۔''

امر کی تعریف سورہ یٰسین کی آخری آیات میں اس طرح کی گئی ہے:

''اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے ''ہو'' اور وہ ہو جاتی ہے۔''

ان آیات سے فارمولا یہ بنا کہ آدمی جسمانی اعتبار سے نا قابل تذکرہ شئے ہے۔اس کے اندر روح ڈال دی گئی تو اسے حواس مل گئے ۔روح اللہ کا امر ہے اور اللہ کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے 'ہو' اور وہ ہو جاتی ہے۔

موجودہ سائنس کی دنیا کہکشانی اور شمسی نظاموں سے روشناس ہو چکی ہے۔کہکشانی اور شمسی نظاموں کی روشنی سے ہماری زمین کا کیا تعلق ہے اور یہ انسان حیوانات، نباتات اور جمادات پر کیا اثر کرتی ہے؟ یہ مرحلہ بھی سائنس کے سامنے آ چکا ہے لیکن ابھی تک سائنس اس بات سے پوری طرح باخبر نہیں ہے کہ شمسی نظاموں کی روشنی انسان، نباتات اور جمادات کے اندر کس طرح اور کیا عمل کرتی ہے اور کس طرح ان کی کیفیات میں رد و بدل کرتی رہتی ہے۔سائنس کا عقیدہ ہے کہ زمین پر موجود ہر شئے کی بنیاد یا قیام لہر اور صرف لہر پر ہے۔ایسی لہر جس کو روشنی کے علاوہ اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا اور پوری کائنات صرف ایک ہی قوت کی مختلف شکلوں کا مظاہرہ ہے۔کائنات میں ممتاز ہونے کی حیثیت سے ہمیں یہ سوچنا پڑے گا کہ یہ لہر اور روشنی کیا چیز ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہے۔

''God said light and there was light''

یعنی خدا نے کہا ''روشنی'' اور روشنی وجود میں آ گئی ۔اس بات کو قرآن پاک نے اللّٰہ نور السموات والارض یعنی اللہ نور ہے آسمان اور زمین کا کہہ کر بیان کیا ہے۔مطلب یہ ہے کہ لہر یا روشنی اور زمین و آسمانوں کی بساط براہ راست اللہ کی ذات مطلق سے قائم ہے جب یہ ساری کائنات بشمول انسان، حیوانات، نباتات اور جمادات روشنیوں اور لہروں پر قائم ہے تو اس کا واضح مطلب یہ نکلتا ہے کہ یہ سب موجودات دراصل اللہ کے نور (لہر) کا مظاہرہ ہے۔اسی لہر یا روشنی کو مذہب نے روح کا نام دیا ہے۔

مذاہب اور تمام علوم ہمیں اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ ہم یہ جان لیں کہ اصل انسان کون ہے، وہ کہاں سے آ کر اپنے لئے جسمانی لباس وضع کرتا ہے اور پھر اس لباس کو اتار کر کہاں چلا جاتا ہے اس بات سے واقف ہونے کے لئے ہادیوں اور رہنماؤں نے قواعد و ضوابط مرتب کئے ہیں۔قرآن پاک نے انسان کو اصل انسان سے متعارف کرنے کے لئے بہت اہم اور نہایت مختصر فارمولے (Equations) بتائے ہیں کہ تاکہ نوع انسانی خود آگاہی حاصل کر کے اصل انسان سے واقف ہو جائے۔

تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ دیکھ کر سوائے افسوس اور دکھ کے کچھ حاصل نہیں ہوتا کہ انسان ہمیشہ مضطرب، بدحال، غمگین، خوف زدہ اور پریشان رہا ہے۔ڈر خوف اور عدم تحفظ کسی زمانے میں بہت زیادہ ہو

جاتا ہے اور کبھی کم لیکن قائم ضرور رہتا ہے۔ جیسے جیسے انسان کی دلچسپیاں مادی وجود میں زیادہ ہوتی ہیں۔ اسی مناسبت سے وہ روشنیوں سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ روشنیوں سے دوری کا نام ہی اضطراب، بے چینی اور درماندگی ہے۔ آج کے دور میں ذہنی کشمکش اور اعصابی کشاکش اپنے عروج پر ہے۔ اس سے محفوظ رہنے اور پرسکون زندگی گزارنے کا طریقہ اگر کوئی ہے تو یہ ہے کہ آدمی اصل انسان سے تعارف حاصل کرلے۔ جب ہم انسان سے واقف ہو جائیں گے تو ہم لہروں اور روشنیوں کی پرمسرت ٹھنڈک میں خود کو محفوظ پائیں گے۔

الا ان اولیاء اللّٰہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون

یہاں اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ انسان کی حیثیت دوسری مخلوقات کے درمیان کیا ہے؟ اور اگر یہ تمام مخلوقات سے افضل ہے تو کیوں ہے؟ اللہ تعالیٰ اس بارے میں کہتے ہیں:

''ہم نے پیش کی اپنی امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر۔ انہوں نے اس امانت کو اٹھانے سے انکار کردیا اور کہا کہ اگر ہم نے اس بار امانت کو اٹھالیا تو ہم ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ بے شک یہ ظالم اور جاہل ہے۔''

قرآن پاک کے اس ارشاد سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تخلیق کائنات کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کے سامنے اپنی امانت اور اپنی خصوصی نعمت پیش کی۔ سب اس بات سے واقف تھے کہ وہ اس عظیم بار امانت کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ لیکن انسان اس امانت کا امین بننے پر رضامند ہو گیا اور اس نے اللہ کی خصوصی نعمت کو قبول کرلیا۔ اس کے باوجود کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی نعمت کا حامل ہے اور یہی امانت اسے تمام مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے، غور طلب بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ظالم اور جاہل قرار دے رہے ہیں۔

تخلیقی فارمولوں کے تحت اللہ کی ہر مخلوق باشعور اور باحواس ہے اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے قائم، زندہ اور متحرک ہے۔ آسمان، زمین اور پہاڑوں کی گفتگو ہمارا ذہن اس طرف متوجہ کرتی ہے کہ انسان کی طرح آسمان، زمین اور زمین کے اندر تمام ذرات اور زمین کے اوپر تمام تخلیقات اور پہاڑ شعور رکھتے ہیں۔ جس طرح آدمی کے اندر عقل کام کرتی ہے اسی طرح پہاڑ بھی عقل رکھتے ہیں کیونکہ کسی بات کا اقرار یا انکار بجائے خود فہم و ادراک اور شعور کی دلیل ہے۔ آیات مقدسہ میں تفکر کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایسی زندگی جس میں بصیرت شامل نہ ہو وہ ظلم اور جہالت سے تعبیر کی جاتی ہے۔ پہاڑوں، آسمانوں اور زمین نے فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ وہ امانت کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس طرح وہ ظلم اور جہالت کے دائرے سے باہر نکل گئے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ کی جو امانت حاصل ہے اس سے صرف نظر، اگر انسانی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انسان مٹی کے ذرات سے کم عقل اور کوتاہ نظر ہے۔ زمین کی صلاحیتوں اور قوتوں پر نگاہ

ڈالنے سے جن مظاہرات کے خاکے سامنے آتے ہیں وہ اپنی جگہ بجائے خود اللہ کی نشانیاں ہیں۔ زمین ایک ہے، دھوپ ایک ہے اور پانی بھی ایک ہے لیکن جب زمین تخلیق کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو ایسے ایسے رنگ بکھیرتی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایک ہی پانی زمین کی کوکھ میں جذب ہونے کے بعد اتنی تخلیقات میں جلوہ گر ہوتا ہے کہ ان کا کوئی شمار و قطار نہیں۔ لگتا ہے کہ زمین کے بطن میں بے شمار سانچے نصب ہیں۔ جس سانچے میں پانی ٹھہر جاتا ہے وہاں نیا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ کبھی کیلا بن جاتا ہے، کہیں سیب بن جاتا ہے۔ کہیں انگور بن جاتا ہے، کہیں پھول بن جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایک چھوٹا سا بیج جب زمین کے پیٹ میں ڈال دیا جاتا ہے تو زمین اس بیج کو پرورش کر کے تناور درخت بنا دیتی ہے بالکل اسی طرح جیسے ماں کے پیٹ میں بچے کی نشوونما ہوتی ہے۔

انسان اور زمین کا تجزیہ کیا جائے تو ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ زمین انسان سے زیادہ باصلاحیت ہے لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کی پیش کردہ اس امانت سے واقف ہونا ہی انسان کو اشرف المخلوقات کے مرتبے پر فائز کرتا ہے اور اگر وہ اس امانت سے واقف نہیں ہے تو بے شک وہ ظالم اور جاہل ہے۔

پیغمبروں نے ہمیں اس بات کا شعور دیا ہے کہ ہم اپنی عقل و فکر کو استعمال کر کے اپنے آپ کو حیوانات سے کس طرح ممتاز کر سکتے ہیں۔ اس کا طریقہ ہمیں سیدنا محمد الرسول اللہ ﷺ کے عمل سے معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ عمل غارِ حرا کی زندگی ہے۔ غارِ حرا کی زندگی سے پیشتر حضور ﷺ پر نہ قرآن نازل ہوا تھا، نہ نماز روزہ فرض کیا گیا تھا اور نہ ہی اسلامی ضابطۂ حیات منظرِ عام پر آیا تھا۔ غارِ حرا کی زندگی ہمیں اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ ہم اپنے پیغمبر ﷺ کے نقشِ قدم پر چل کر ایسے طریقے اختیار کریں۔ جس سے ہمارے اندر یہ بات مشاہدہ بن جائے کہ انسان کی صلاحیتیں محدود نہیں ہیں۔ یعنی کوئی انسان اگر چاہے تو روشنیوں کے فارمولوں سے باخبر ہو کر ٹائم اینڈ اسپیس کی گرفت سے آزاد ہو سکتا ہے۔ اس کا بنیادی طریقہ یہ ہے کہ ہر طرف سے ذہن ہٹا کر یکسوئی سے ایک مرکز پر موڈ کو متوجہ کر لیا جائے۔ بس (Concentration) کی یہی کیفیت آدمی کو اصل انسان سے متعارف کرا دیتی ہے۔ اسی طریقہ تعلیم کا نام مراقبہ ہے۔

مراقبہ کیا ہے؟............ اس کو سمجھنے کے لئے نظر کے قانون کو بیان کرنا ضروری ہے۔ آدمی دو طرح دیکھتا ہے۔ ایک براہ راست اور دوسرا بالواسطہ۔ بالواسطہ دیکھنا یہ ہے کہ ہماری نظر کسی چیز کے مادی خول سے ٹکرا کر رک جائے اور اس کا عکس ہمارے دماغ کی اسکرین پر منتقل ہو جائے۔ براہ راست دیکھنا یہ ہے کہ ہماری نظر کسی چیز کے مادی خول سے ٹکرائے بغیر اس کی حقیقت کا مشاہدہ کر لے۔ غیب کی دنیا کو دیکھنے کے لئے براہ راست نظر کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

اسی بات کو ایک دوسری طرز پر اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ ہماری زندگی دو حواس سے مرکب ہے یا ہمارے اندر دو دماغ کام کرتے ہیں۔ ایک وہ دماغ ہے جو ہمیں ٹائم اور اسپیس میں قید رکھتا ہے اس کے ذریعے ہم محض مادے (Matter) کو دیکھتے، چھوتے اور سمجھتے ہیں۔ دوسرا دماغ وہ ہے جو ٹائم اسپیس سے آزاد ہے۔ اس دماغ کے ذریعے ہم غیب کی دنیا یا مادے سے ماوراء دنیا سے متعارف ہو جاتے ہیں۔ اسی دماغ کے ذریعے ہم ملائکہ، اعراف، برزخ اور ملاء اعلیٰ اور بالآخر اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کرتے ہیں۔ قرآن پاک کی زبان میں ان دو حواسوں یا دماغوں کا نام ''دن'' اور ''رات'' ہے۔ ''دن'' کے حواس میں انسان ٹائم اور اسپیس میں مقید ہے۔ اور ''رات'' کے حواس میں انسان ٹائم اور اسپیس سے آزاد ہے۔ قرآن پاک میں جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات (غیبی انکشافات) دینے کا ذکر ہے وہاں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے تیس راتوں کا اور دس راتوں کا اضافہ کر دیا۔ اس طرح اس کے رب کی مقرر کردہ مدت پوری چالیس رات ہو گئی۔''

غور طلب بات یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام چالیس دن اور چالیس رات کوہ طور پر رہے لیکن اللہ تعالیٰ صرف رات کا تذکرہ کر رہے ہیں، دن کا نہیں مطلب صاف ہے کہ اس پورے وقفے اور قیام میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر رات کے حواس غالب رہے۔

سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی معراج کے تذکرے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے بندے کو رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک تا کہ اسے اپنی نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔''

معراج کے بیان میں بھی رات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ معراج کے دوران حضور ﷺ پر جو کچھ غیبی واردات ہوئی وہ رات کے حواس میں ہوئی۔ بیان کرنا یہ مقصود ہے کہ غیبی انکشافات صرف رات کے حواس میں حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ دن کے حواس کے ساتھ غیب میں داخل ہونا ممکن نہیں۔

مراقبہ دراصل اسی بات کی مشق کا نام ہے جس میں کوئی بندہ یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ رات کے حواس میں داخل ہو کر کائنات کے حقائق اور اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کر لے۔ مراقبہ کی حالت میں انسان اپنی پوری ذہنی توجہ (Concentration) ایک نقطہ یا ایک تصور پر مرکوز کر دیتا ہے۔ جیسے جیسے مرکزیت قائم ہوتی ہے اسی مناسبت سے انسان غیب سے قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر

غیب کی دنیا میں داخل ہونے کے قابل ہو جاتا ہے۔

بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ مراقبہ کرنے والا کوئی بندہ آنکھیں بند کئے ہوئے بیٹھا ہے لیکن مراقبہ دراصل ایک طرز فکر ہے اور وہ یہ ہے کہ مراقبہ کرنے والے ظاہری حواس کے ساتھ ساتھ باطنی حواس میں سفر کرتا ہے۔ آیئے! اب ہم یہ تلاش کریں کہ مراقبہ کی ملی جلی کیفیت ایک مخصوص انداز نشست اور ایک مخصوص طریقے کے بغیر بھی ہمارے اندر موجود ہے یا نہیں۔ ظاہری حواس سے دوری کی کیفیت ہماری زندگی میں ارادتاً یا غیر ارادی طور پر دونوں طرح واقع ہوتی ہے۔ مثلاً ہم سوتے ہیں۔ سونے کی حالت میں ہمارا دماغ ظاہری حواس سے عارضی طور پر اپنا رشتہ منقطع کر لیتا ہے۔

ہر انسان پیدائش سے موت تک دو کیفیات میں سفر کرتا ہے۔ ایک کیفیت کا نام بیداری اور دوسری کیفیت کا نام خواب یا نیند ہے۔ بیداری کی حالت میں اس کے اوپر ٹائم اسپیس (زمان و مکان) مسلط ہے اور خواب میں وہ ٹائم اسپیس کی گرفت سے آزاد ہوتا ہے۔ خواب دراصل مراقبہ سے قریب ایک کیفیت ہے۔ مراقبہ مشق ہے اس بات کے لئے کہ خواب کو بیداری میں منتقل کر لیا جائے۔ مراقبہ میں انسان پر کم و بیش وہ تمام حالتیں وارد ہو جاتی ہیں جن میں وہ سو جاتا ہے یا خواب دیکھتا ہے۔ اس طرح مراقبہ کی مشق کرتے کرتے وہ خواب کی واردات و کیفیات میں اس طرح جذب ہو جاتا ہے کہ جس طرح وہ بیداری کی کیفیات و واردات میں زندگی گزار رہا ہے۔

قرآن پاک کی اصطلاح ''صلوٰۃ قائم کرنا'' ہمیں اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ ہم نماز میں ذہنی مرکزیت حاصل کر کے اصل انسان سے واقف ہو جائیں۔ ''صلوٰۃ'' کے ساتھ لفظ ''قائم کرنا'' اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نماز میں ذہنی مرکزیت اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر نماز میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ذہنی مرکزیت قائم نہ ہو تو وہ نماز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''ہلاکت ہے ان نمازیوں کے لئے جو اپنی نمازوں سے بے خبر ہیں۔'' (الماعون پارہ ۳۰)

اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتے ہیں:

''فلاح پائی ان مومنوں نے جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔''

قیام صلوٰۃ اور نماز میں خشوع و خضوع حاصل کرنے کے لئے اللہ کے دوست اولیاء اللہ نے مراقبہ کو ضروری قرار دیا ہے۔ مراقبہ کرنے سے کوئی بندہ اللہ سے قریب ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی قربت کے ساتھ نماز قائم کرنا سیدنا حضور اکرم ﷺ کے ارشاد کے مطابق ''نماز مومن کی معراج ہے۔'' اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے

مطابق انسان اشرف المخلوقات ہے۔انصاف اور بصیرت کا تقاضا ہے کہ ہم تلاش کریں کہ اشرف المخلوقات ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔عام زندگی میں انسان کی جو صلاحیت مظہر بنتی ہے اور جو اعمال و حرکات سے اس سے سرزد ہوتے ہیں، صرف ان سے اشرف المخلوقات ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ پیدائش، شعور، بھوک، پیاس اور خواہشات چاہے جسمانی ہوں یا جنسی، میں انسان ہے دوسری مخلوقات کے برابر ہے۔البتہ مظاہراتی زندگی سے ہٹ کر اس درجے پر فائز ہے جو آسمانوں، پہاڑوں اور زمین کو حاصل نہیں یعنی وہ اللہ تعالیٰ کا امین ہے۔ کوئی انسان اگر اس امانت سے واقفیت رکھتا ہے تو وہ اشرف المخلوقات بصورت دیگر آدم زاد اور دوسری مخلوقات میں کوئی خط امتیاز نہیں کھینچا جا سکتا۔اللہ تعالیٰ کی خصوصی نعمت حاصل ہونے کے باوجود اس نعمت سے بے خبر رہنا یا ہونا سراسر ظلم اور جہل ہے۔

اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اس خصوصی انعام سے مستفیض ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہمیں اپنی ذات کا عرفان حاصل ہو۔تصوف میں اس علم کو خود آگاہی کا نام دیا جاتا ہے۔خود آگاہی کے بعد انسان کے اوپر علوم کے جو دروازے کھل جاتے ہیں، ان میں سے گزر کر بالآخر اللہ کے ساتھ بندے کا رشتہ مستحکم ہو جاتا ہے اور جب کوئی بندہ مستحکم رشتے کے دائرے میں قدم رکھ دیتا ہے تو وہ اس امانت سے وقوف حاصل کر لیتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو ودیعت فرمائی ہے۔

انسان اور لوح محفوظ

انسان کا ذہن اور طرز فکر ماحول سے منتج ہے جس قسم کا ماحول ہوتا ہے اس ہی طرز کے اعمال کے نقش در و بست یا کم و بیش ذہن میں نقش ہو جاتے ہیں۔ جس حد تک یہ نقوش گہرے یا ہلکے ہوتے ہیں، اسی مناسبت سے انسانی زندگی میں طرز فکر یقین بن جاتی ہے۔ اگر کوئی بچہ ایسے ماحول میں پرورش پاتا ہے جہاں والدین اور اس کے اردگرد ماحول کے لوگ ذہنی پیچیدگی، بد دیانتی اور تمام ایسے اعمال کے عادی ہوں جو دوسروں کے لئے نا قابل قبول اور ناپسندیدہ ہیں تو بچہ لازمی طور پر وہی طرز قبول کر لیتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی بچہ کا ماحول پاکیزہ ہے تو وہ پاکیزہ نفس ہوگا۔ عام مشاہدہ یہ ہے کہ بچہ وہی زبان سیکھتا ہے جو ماں باپ بولتے ہیں۔ وہی عادات و اطوار اختیار کرتا ہے جو اس کے والدین سے ورثہ میں اسے منتقل ہوتے ہیں۔ بچہ کا ذہن آدھا والدین کا ورثہ ہوتا ہے اور آدھا ماحول کے زیر اثر بنتا ہے۔ یہ مثال صرف بچوں کیلئے مخصوص نہیں، افراد اور قوموں پر بھی یہی قانون نافذ ہے۔ ابتدائے آفرینش سے تا ایں دم جو کچھ ہو چکا ہے، ہو رہا ہے یا آئندہ ہوگا وہ سب کا سب نوع انسانی کا ورثہ ہے اور یہی ورثہ قوموں میں اور افراد میں منتقل ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔

قانون:

بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو شعوری اعتبار سے بالکل کورا (Blank) ہوتا ہے۔ لیکن اس کے اندر شعور کی داغ بیل پڑ چکی ہوتی ہے۔ شعور کی یہ داغ بیل پڑ چکی ہوتی ہے۔ شعور کی یہ داغ بیل ماں باپ کے شعور سے منتج ہے۔ یعنی ماں کا شعور جمع (+) باپ کا شعور برابر (=) بچہ کا شعور۔ یہی شعور بتدریج زندگی کے تقاضوں اور حالات کے ردو بدل کے ساتھ ضرب (Multiply) ہوتا رہتا ہے۔

۱۔ بچہ کا شعور جمع (+) ماحول کا ورثہ برابر (=) فرد کا شعور۔

۲۔ تاریخی حالات و واقعات کا شعور جمع (+) آدم کا شعور برابر (=) قوم کا شعور

۳۔ تاریخی حالات کا شعور جمع (+) آدم کا شعور برابر (=) اسلاف کا شعور

بتانا یہ مقصود ہے کہ ہمارے شعور میں آدم کا شعور شامل ہے اور یہ جمع در جمع ہو کر ارتقائی شکل و صورت اختیار کر رہا ہے۔ دو چیزیں جب ایک دوسرے میں باہم مل کر جذب ہو جاتی ہیں تو نتیجے میں تیسری چیز وجود میں آجاتی ہے۔

جیسے پانی میں شکر ملانے سے شربت بن جاتا ہے۔ پانی میں اتنی حرارت شامل کر دی جائے جو آگ

کے قریب ترین ہو تو پانی کی وہی صفات ہو جائیں گی تو جو آگ کی ہوتی ہیں اور اگر پانی میں اتنی سردی شامل کر دی جائے جو برف کی ہے تو پانی کی وہی خصوصیات ہو جائیں گی جو برف کی ہوتی ہیں۔ اسی طرح جب ماں اور باپ کا شعور ایک دوسرے میں جذب ہوتا ہے تو نتیجہ میں تیسرا شعور وجود میں آتا ہے جس کو ہم بچہ کہتے ہیں۔

ابھی ہم نے انسانی ارتقاء کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ ارتقاء شعوری حواس پر قائم ہے۔ اور اس ارتقاء میں ہر آن اور ہر لمحہ تبدیلی ہو رہی ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ آن اور لمحات کی تبدیلی کا نام ارتقاء ہے۔

فطرت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ البتہ جبلت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کے اندر فطرت اور جبلت دونوں چیزیں ہوتی ہیں۔ بچے کے اوپر جبلت کے مقابلے میں فطرت کا غلبہ ہوتا ہے۔ جیسے جیسے والدین کے شعور کا حاصل شعور، ماحول کے شعور سے ضرب (Multiply) ہوتا ہے۔ اصل شعور میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور جیسے جیسے اضافہ ہوتا ہے بچہ کے اوپر جبلت غالب آجاتی ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو جبلت کا غلبہ فطرت کے لئے پردہ بن جاتا ہے اور جوں جوں یہ پردہ دبیز ہوتا ہے آدمی فطرت سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔

قرآن پاک میں جن انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، اس پر معمولی سمجھ بوجھ کر آدمی بھی غور کرے تو یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ ان پیغمبران کرام کا سلسلہ ایک ہی خاندان سے وابستہ ہے۔ (تذکرہ ان پیغمبروں کا ہو رہا ہے جن کا ذکر قرآن پاک کی کڑی در کڑی کیا گیا ہے)۔ قرآن پاک کے ارشاد کے مطابق عرب کی سرزمین پر جتنے پیغمبر مبعوث ہوئے وہ سب حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک قانون بنا دیا ہے۔ اس لئے قدرت اس قانون پر عملدرآمد کرنے کی پابند ہے۔ اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس طرح بیان کیا ہے:

''اللہ تعالیٰ کی سنت میں نہ تبدیلی ہوتی ہے نہ تعطل واقع ہوتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق زمین کے ہر حصے میں پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں۔ روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر مبعوث ہوئے لیکن سرزمین عرب پر جو پیغمبر مبعوث ہوئے اور جن کا تذکرہ قرآن میں کیا گیا، وہ سب حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہیں۔ اس بات کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی طرز فکر ان کی اولاد کو منتقل ہوتی رہی۔

اس سے پہلے ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ انسانی ارتقاء مسلسل اور متواتر شعور کی منتقلی کا نام ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگ غاروں میں رہتے تھے۔ پھر لوگ پتھر کے زمانے (Stoneage) میں آگئے اور اس کے بعد پتھر کے وہی ہتھیار یا ضروریات زندگی کا سامان دوسری دھاتوں میں منتقل ہوتا چلا گیا۔

علیٰ ہذا القیاس نوع انسانی اس ہی ورثہ پر چل رہی ہے جو اس کو آدم سے منتقل ہوا ہے۔ آدم نے نافرمانی کی اولاد کو نافرمانی کا ورثہ بھی منتقل ہوگیا۔ آدم نے عجز و انکسار کے ساتھ عفو و درگذر کی درخواست کی، یہ طرز فکر بھی آدم کی اولاد میں منتقل ہوگئی۔ ان تمام باتوں کا حاصل یہ ہے کہ آدم کی اولاد کو وہی ورثہ ملتا ہے جس ماحول میں وہ پرورش پاتا ہے۔

طرز فکر دو ہیں۔ ایک طرز فکر بندے کو اپنے خالق سے دور کرتی ہے اور دوسری طرز فکر بندے کو خالق سے قریب کرتی ہے۔ ہم جب کسی ایسے انعام یافتہ شخص سے قربت حاصل کرتے ہیں جس کو وہ طرز فکر حاصل ہے جو خالق سے قریب کرتی ہے تو قانون قدرت کے مطابق ہمارے اندر وہی طرز فکر کام کرنے لگتی ہے اور ہم جس حد تک اس انعام یافتہ شخص سے قریب ہوجاتے ہیں اتنا ہی اس کی طرز فکر سے آشنا ہوجاتے ہیں۔ اور انتہا یہ ہے کہ دونوں کی طرز فکر ایک بن جاتی ہے۔

لوح محفوظ کے قانون کے مطابق دیکھنے کی طرزیں دو ہیں۔ ایک دیکھنا براہ راست ہوتا ہے اور ایک دیکھنا بالواسطہ۔ براہ راست دیکھنے سے منشاء یہ ہے کہ جو چیز براہ راست دیکھی جارہی ہے وہ کسی میڈیم کے بغیر دیکھی جارہی ہے۔ بالواسطہ دیکھنے کا مطلب ہے کہ جو چیز ہمارے سامنے ہے وہ ہم کسی پردے میں کسی ذریعہ سے یا کسی واسطے سے دیکھ رہے ہیں۔

اب ہم نظر کے اس قانون کو دوسری طرح بیان کرتے ہیں۔ کائنات میں جو کچھ ہے، جو کچھ تھا، جو کچھ ہو رہا ہے یا آئندہ ہونے والا ہے، وہ سب کا سب لوح محفوظ پر نقش ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان بذات خود اور انسانی تمام حواس بھی لوح محفوظ پر نقش ہیں۔ لوح محفوظ پر نقش ہونا یہ ہے کہ انسان اور انسانی تقاضے جس طرح لوح محفوظ پر نقش ہیں اس میں ان تقاضوں کی کنہ موجود ہے۔ کنہ یعنی ایسی بنیاد (Base) جس میں چوں چرا، نفی اثبات اور اونچ نیچ نہیں ہے۔ بس جو کچھ ہے وہ ہے۔

لوح محفوظ پر اگر بھوک پیاس کے حواس موجود ہیں تو صرف بھوک و پیاس کے حواس موجود ہیں۔ یہ حواس لوح محفوظ سے نزول کرکے لوح دوئم میں آتے ہیں تو ان میں معنویت پیدا ہوجاتی ہے۔ یعنی پیاس پانی سے بجھتی ہے اور بھوک کا مداوا غذا سے ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ براہ راست نظر کے قانون میں صرف بھوک پیاس کا تقاضا آتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ بھوک پیاس کے تقاضے کیسے پورے کئے جائیں۔ بھوک اور پیاس کو کس طرح رفع کیا جائے۔ یہ بالواسطہ نظر کے قانون میں آتا ہے۔ یعنی ایک اطلاع ہے، جب تک وہ محض ایک اطلاع (Information) ہے یہ براہ راست طرز فکر ہے اور جب اس اطلاع میں معانی شامل کرلیے جاتے ہیں تو یہ بالواسطہ طرز فکر بن جاتی ہے۔ اس کی مثال بہت سادہ اور آسان ہے۔ ایک آدمی آنکھوں پر چشمہ نہیں پہنتا، وہ جو کچھ دیکھتا ہے براہ راست

دیکھتا ہے۔دوسرا آدمی چشمہ لگاتا ہے وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے اس کے دیکھنے میں گلاس میڈیم بن گیا ہے۔اب اسی مثال کو اور زیادہ گہرائی میں بیان کیا جائے تو اس طرح کہا جائے گا کہ عینک میں اگر سرخ رنگ کا گلاس ہے تو ہر چیز سرخ نظر آئے گی، نیلا گلاس ہے تو ہر چیز نیلی نظر آئے گی۔جس طرح انسانی تقاضے اور انسان کی نظر لوح محفوظ پر نقش ہے اسی طرح شیشہ، شیشے کا رنگ اور شیشے کی تمام صلاحیتیں بھی لوح محفوظ پر نقش ہیں۔جب ہم کسی رنگین شیشے کا اپنا میڈیم بنائیں گے تو نظر وہی دیکھے گی جو ہمیں شیشہ دکھائے گا۔

بات طرز فکر کی ہو رہی تھی۔طرز فکر اور نظر کا قانون ایک ہی بات ہے۔طرز فکر ہی براہ راست اور بالواسطہ کام کرتی ہے۔ایک طرز فکر ایسی ہے جو بالواسطہ کام کرتی ہے۔اور ایک طرز فکر یہ ہے کہ براہ راست کام کرتی ہے۔کوئی آدمی اگر ایسے شخص کی طرز فکر کو اپنے لئے واسطہ بناتا ہے جس کی طرز فکر براہ راست کام کر رہی ہے تو اس شخص کے اندر وہی طرز فکر منتقل ہو جاتی ہے جس طرح رنگین شیشہ آنکھ پر لگانے سے ہر چیز رنگین نظر آتی ہے۔روحانی تعلیم دراصل طرز فکر کی اس صلاحیت کو اپنے اندر منتقل کرنے کا ایک عمل ہے۔

جتنے پیغمبر علیہم الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے ان سب کی طرز فکر یہی رہی کہ ہمارا رشتہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ براہ راست قائم ہے۔اور یہ رشتہ ہی کائنات کو جاری وساری رکھے ہوئے ہے۔پیغمبروں کی تعلیمات بھی یہی رہیں کہ بندے کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ بندہ ذات باری تعالیٰ کے رشتے کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔پیغمبران کرامؑ نے اسی طرز فکر کو مستحکم کرنے کے لئے اچھائی اور برائی کا تصور عطا کیا۔اگر اچھائی اور برائی کا تصور نہ ہو تو نیکی اور بدی کے اختیارات نا قابل تذکرہ ہو جائیں گے۔اس بات سے کوئی آدمی انکار کی مجال نہیں رکھتا کہ شیطان کو بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔شیطان یا شر کو ہم اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے جدا نہیں کر سکتے لیکن شیطان زندگی کا ایک ایسا رخ ہے جو اللہ تعالیٰ کیلئے ناپسندیدہ ہے اور شیطنت کے برعکس اللہ تعالیٰ کے احکامات کی بجا آوری اللہ کیلئے پسندیدہ عمل ہے لیکن جو لوگ تخلیق کے اس قانون سے واقف ہیں اور جن کا ایمان یقین اور مشاہدہ بن جاتا ہے وہ ہر بات کو من جانب اللہ سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی کو اپنی زندگی بنا لیتے ہیں۔

حضرت رابعہ بصریؒ سے کسی نے سوال کیا:

''آپ نے شادی نہیں کی۔کیا آپ کو شیطان سے ڈر نہیں لگتا؟''

حضرت مائی صاحبہؒ نے فرمایا:

''مجھے رحمان سے ہی فرصت نہیں۔''

اسی بات کو خواجہ غریب نوازؒ نے اس طرح فرمایا ہے:

''یار دم بدم و بار بار ی آید''

خواجہ غریب نوازؒ فرماتے ہیں کہ میری ہر سانس کے ساتھ بسا ہوا ہے اور میرا ہر سانس اللہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ ایسے برگزیدہ اور پاکیزہ نفس بندے جن کا ذہن ایمان وایقان سے معمور رہوتا ہے، وہ اللہ کی دی ہوئی توفیق کے ساتھ ہر وقت خیر کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ شر اور خیر دونوں لازم وملزوم ہیں، بالکل اسی طرح جیسے روشنی اور تاریکی، گرم اور سرد، تلخ اور شیریں، راحت اور تکلیف، خوشی اور غم، غصہ اور محبت وغیرہ لازم وملزوم ہیں۔ بظاہر یہ بات خلاف عقل ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے یہ وہ پاکیزہ نفوس ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہمارے بندے ایسے بھی ہیں جو ہماری زبان سے بولتے ہیں، جو ہمارے کانوں سے سنتے ہیں اور ہمارے ہاتھ سے پکڑتے ہیں۔ ان بندوں کی طرز فکر میں یہ بات یقین کا درجہ حاصل کر لیتی ہے کہ ہماری حیثیت ایک معمول کی ہے اور ہم اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہیں۔

دوسرا طبقہ وہ ہے جو اچھائی اس لئے اختیار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اچھا سمجھتے ہیں اور برائی سے اس لئے بچتا اور پرہیز کرتا ہے کہ برائی کو اللہ ناپسند کرتے ہیں۔

خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہ دونوں طرز فکر ان کی امت کو منتقل ہوئیں۔ علم کے بارے میں گفتگو کے دوران حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ مجھے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے علم کے دو لفظ ملے۔ ایک میں نے ظاہر کر دیا اور دوسرے کو چھپالیا۔ لوگوں نے کہا علم بھی کوئی چھپانے کی چیز ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اگر وہ لفظ میں لوگوں پر ظاہر کر دوں تو تم لوگ مجھے قتل کر دو گے۔ مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ علم جس کو حضرت ابو ہریرہؓ نے چھپایا کسی کو منتقل نہیں ہوا یا حضرت ابو ہریرہؓ نے کسی کو نہیں سکھایا۔ بات یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علوم میں سے ایک علم وہ ہے جو عوام الناس پر ظاہر کر دیا گیا جس کو علم شریعت کہتے ہیں اور دوسرا علم وہ ہے جو عوام الناس کی ذہنی اور شعوری سکت سے ماوراء ہے۔ علم شریعت تقرب الی اللہ کے وہ اعمال واشغال اور قوانین ہیں جن پر ہر فرد چل کر وہ زندگی اختیار کر سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کیلئے پسندیدہ ہے۔ اور دوسرے علم میں اللہ تعالیٰ کے وہ اسرار و رموز ہیں جو صرف کائنات کے نظام (Administration) سے متعلق ہیں۔ ایسے بندوں کی زندگی سراپا اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہوتی ہے۔ وہ جب اللہ کو پکارتے ہیں تو ان کے ذہن میں یہ تصور کہ اس کے صلے میں انہیں جنت ملے گی اور نہ ہی کوئی عمل وہ اس لئے کرتے ہیں کہ اس عمل کے کرنے سے انہیں دوزخ سے نجات ملے گی۔ وہ صرف اور صرف اس لئے اللہ کو پکارتے ہیں کہ ان کے سامنے اللہ کی ذات کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم صادر ہوتا ہے وہ اس کی تعمیل کرتے ہیں۔

قرآن پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے اس بندے سے کہا کہ آپ نے ناحق ایک جان کو ہلاک کرڈالا تو اس بندے نے جواباً کہا کہ میں نے جو کچھ کیا اپنی طرف سے نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ ایسے چاہتے تھے۔ میں نے ایسا کر دیا۔ اب ہم یوں کہیں گے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو علم کا وہ لفظ حاصل تھا جس کو علم شریعت کہتے ہیں اور بندے کے پاس وہ علم تھا جس کو تکوین یا (Administration) کا نام دیا جاتا ہے۔ راستے دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین ہیں۔ ایک راستہ پر طرز فکر آزاد ہے اور دوسرے راستہ پر طرز فکر پابند ہے۔ پابند طرز فکر کو اپنے دائرہ اختیار میں قبول کرتی ہے۔ دوسرا راستہ آزاد طرز فکر ہے جس میں ایسا ویسا یا چوں چرا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ رات کیلئے اگر یہ فرمادیں کہ یہ دن ہے تو آزاد طرز فکر میں یہ بات آتی ہی نہیں کہ یہ رات ہے، دنیا کے چار ارب انسان یہ کہیں کہ یہ رات ہے لیکن وہ ایک تنہا آدمی یہی کہے گا کہ یہ دن ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمانے کے بعد رات اس کے مشاہدے میں دن بن جاتی ہے اور اس کے تمام حواس وہی بن جاتے ہیں جو دن کے حواس ہیں۔ اس میں ایک راز یہ ہے کہ رات دن کی کوئی حیثیت نہیں ہے بلکہ رات دن اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ایک تخلیق ہے جب اللہ تعالیٰ نے رات کو دن فرمایا تو تخلیقی فارمولے بدل گئے لیکن چونکہ ایک مخصوص آدمی کیلئے فرمایا اس لئے فارمولے میں تبدیلی صرف اسی آدمی کیلئے مظہر بنی۔ رات اور دن دراصل ایک تخلیق یا ایک یونٹ کے دو رخ ہیں۔ ایک رخ کا نام دن ہے اور دوسرے رخ کا نام رات ہے۔ یہ دونوں چیزیں الگ الگ نہیں ہیں۔

رات کے حواس آزاد طرز فکر ہے اور دن کے حواس پابند طرز فکر ہے۔ دن کے حواس وہ زندگی ہے جہاں انسان اپنے اختیارات استعمال کر کے زندگی بسر کرتا ہے۔ رات کے حواس وہ طرز فکر ہے جہاں انسانی اختیارات زیر بحث نہیں آتے۔ کوئی فرد دن کے حواس میں اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کرنے یا غیبی دنیا میں داخل ہونے کیلئے بہر حال رات کے حواس کا سہارا لینا پڑتا ہے اور جب رات کے حواس دن کے حواس پر غالب آجاتے ہیں تو طرز فکر آزاد ہو جاتی ہے اور آزاد طرز فکر سے انسان اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ترجمہ: ہم رگ جاں سے زیادہ قریب ہیں۔

شریعت کے قوانین پر عمل کرنے والے بندے بھی یہی کوشش کرتے ہیں کہ آزاد طرز فکر یا رات کے حواس میں داخل ہو جائیں۔ جس حد تک وہ کوشش میں کامیاب ہوتے ہیں اسی حد تک ان کی طرز فکر آزاد ہو جاتی ہے لیکن چونکہ وہ اختیارات کی حد بندیوں میں جکڑے ہوئے ہیں اس لئے آزاد طرز فکر یا رات کے حواس

میں بھی یہ حد بندیاں قائم رہتی ہیں۔ حد بندیاں قائم رہنے کی وجہ سے وہ اپنی عبادات و ریاضیات کا حاصل جنت کا حصول یا دوزخ سے آزادی سمجھتے ہیں۔ جبکہ جنت کا حصول صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ جنت میں جنتی اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا مشاہدہ کرے گا۔

جب کوئی بچہ استاد کی شاگردی میں آتا ہے تو استاد اس سے کہتا ہے۔ ''پڑھ! الف، بے، جیم وغیرہ وغیرہ'' بچے کو اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ الف، بے، جیم کیا ہے۔ وہ اپنی لاعلمی کی بنا پر جو کچھ استاد اسے سکھاتا ہے اسے قبول کرلیتا ہے لیکن اگر یہی بچہ الف، بے، جیم کو قبول نہ کرے تو وہ علم نہیں سیکھ سکتا۔ مفہوم یہ ہے کہ بچے کی لاعلمی اس کا علم بن جاتا ہے جو بحیثیت شاگرد استاد کی رہنمائی قبول کرلیتا ہے اور درجہ بدرجہ علم سیکھتا چلا جاتا ہے۔

ایک آدمی جو باشعور ہے اور کسی نہ کسی درجہ میں دوسرے علوم کا حامل بھی ہے، جب روحانیت کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کی پوزیشن بھی ایک بچے کی ہوتی ہے۔ روحانیت میں شاگرد کو مرید اور استاد کو مراد کہا جاتا ہے۔ مرید کے اندر اگر بچے کی افتادِ طبیعت نہیں ہے تو وہ مراد کی بتائی ہوئی کسی بات کو اس طرح قبول نہیں کرے گا جس طرح کوئی بچہ الف، بے، جیم کو قبول کرتا ہے۔ چونکہ روحانی علوم میں اس کی حیثیت ایک بچے سے زیادہ نہیں ہے اس لئے اسے وہی طرزِ فکر اختیار کرنا پڑے گی جو بچے کو الف، بے، جیم سکھاتی ہے۔

روحانی استاد اپنے شاگرد سے کہتا ہے کہ آنکھیں بند کرکے بیٹھ جاؤ۔ کیوں بیٹھ جاؤ؟ اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں بتاتا۔ بالکل اس طرح جس طرح کوئی استاد بچے سے کہتا ہے کہ پڑھو الف اور یہ کوئی نہیں بتاتا کہ الف کیا ہے اور کیوں ہے؟ پھر وہ کہتا ہے کہ آنکھیں بند کرکے تصورِ شیخ کرو لیکن یہ نہیں بتاتا کہ تصورِ شیخ کیا ہے؟ اور کیوں کیا جائے؟ اگر ابتداء میں ہی شاگرد اپنے علم کے زعم میں اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرے کہ آنکھیں بند کیوں کی جائیں، تصورِ شیخ کیوں کیا جائے اور اسے کیا حاصل ہوگا تو یہ طرزِ فکر شاگرد کے عمل کے منافی ہے۔ کسی علم کو سیکھنے میں صرف یہ طرزِ فکر کام کرتی ہے کہ استاد کے حکم کی تعمیل کی جائے اور استاد کی تعمیلِ حکم یہ ہے کہ لاعلمی اس کا شعار بن جائے۔

طریقت اور شریعت کوئی الگ الگ راستے نہیں ہیں۔ شریعت میں پہلے علم ہے اور عمل بعد میں لیکن یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ اس علم کی بنیاد بھی لاعلمی پر ہے۔ طریقت میں عمل پہلے ہے اور علم بعد میں۔ روحانی طالب علم کو کچھ سیکھنے کے لئے ہر حال میں پہلے اپنے علم کی نفی کرنی پڑتی ہے۔

امام غزالیؒ کا ایک بڑا مشہور واقعہ ہے۔ آپ اپنے زمانے کے یکتائے روزگار تھے۔ بڑے بڑے جید علماء ان کے علوم سے استفادہ کرتے تھے۔ بیٹھے بیٹھے ان کو خیال آیا کہ خانقاہی نظام کو بھی دیکھنا چاہئے، یہ کیا

ہے؟ روایات مختلف، کوئی تین سال کہتا ہے کوئی سات سال وہ عرصہ دراز تک لوگوں سے ملتے رہے اور اس سلسلے میں انہوں نے دور دراز کا سفر بھی کیا۔ بالآخر مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔ کسی نے پوچھا: ''آپ ابوبکر شبلی سے بھی ملے؟'' امام غزالیؒ نے فرمایا کہ میں نے اب تک روحانی مکتبہ فکر کا کوئی مشہور آدمی نہیں چھوڑا جس سے ملاقات نہ کی ہو۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ سب کہانیاں ہیں جو فقراء نے اپنے بارے میں مشہور کر رکھی ہیں۔ پھر انہیں خود ہی خیال آیا کہ ایک مشہور آدمی رہ گیا ہے اس سے بھی کیوں نہ ملاقات کر لی جائے۔

قصہ کوتاہ، وہ ملاقات کے لئے عازم سفر ہوئے۔ مختلف تذکروں میں یہ بات ملتی ہے کہ جس وقت وہ عازم سفر ہوئے تو ان کا لباس اور سواری میں گھوڑے کے اوپر زین وغیرہ کی مالیت اس زمانہ میں بیس ہزار اشرفی تھی۔ کیا یہ واقعتاً صحیح ہے اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہتے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ امام غزالیؒ بہت شان وشوکت اور دبدبہ کی زندگی بسر کرتے تھے۔ منزلیں طے کر کے جب وہ حضرت ابوبکر شبلیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ایک مسجد میں بیٹھے ہوئے اپنی گدڑی سی رہی تھے۔ امام غزالیؒ حضرت ابوبکر شبلیؒ کی پشت کی جانب کھڑے ہو گئے۔ حضرت ابوبکر شبلیؒ نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر فرمایا کہ غزالیؒ آ گیا۔ تو نے بہت وقت ضائع کر دیا ہے۔ شریعت میں علم پہلے ہے، عمل بعد میں اور طریقت میں عمل پہلے اور علم بعد میں ہے۔ اگر تو اس بات پر قائم رہ سکتا ہے تو میرے پاس قیام کر ورنہ واپس چلا جا۔ امام غزالیؒ نے ایک منٹ توقف کیا اور کہا کہ میں آپ کے پاس قیام کروں گا۔ یہ سن کر حضرت ابوبکر شبلیؒ نے فرمایا کہ سامنے مسجد کے کونے میں جا کر کھڑے ہو جاؤ اور وہ مودب ایستادہ ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد بلایا دعا سلام ہوئی اور اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ بہت خاطر مدارت کی۔ امام غزالیؒ بہت خوش ہوئے کہ مجھے بہت اچھا روحانی استاد مل گیا ہے، جس نے میرے اوپر آرام و آسائش کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ چند روز بعد حضرت شبلیؒ نے امام غزالیؒ سے فرمایا: ''بھائی! اب کام شروع ہو جانا چاہئے۔ اور کام کی ابتدا یہ ہے کہ ایک بوری کھجور لے کر شہر کے بازار میں جاؤ اور بوری کھول کر یہ اعلان کرو کہ جو آدمی میرے سر پر ایک چپت رسید کرے گا، اسے ایک کھجور ملے گی۔ امام غزالیؒ شام کو جب کھجوریں تقسیم کر کے واپس آئے تو پوچھا۔ حضرت! یہ کام مجھے کتنے عرصے تک کرنا پڑے گا؟ حضرت ابوبکر شبلیؒ نے فرمایا ایک سال اور وہ ایک سال تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ سال پورا ہوا تو امام غزالیؒ نے یاد دہانی کرائی کہ حضور ایک سال پورا ہو گیا ہے۔ حضرت ابوبکر شبلیؒ نے فرمایا ایک سال اور۔ دو سال پورے ہونے کے بعد فرمایا ایک سال اور۔ جب تین سال پورے ہو گئے اور امام غزالیؒ نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تو حضرت ابوبکر شبلیؒ نے ان سے پوچھا۔ کیا سال ابھی پورا نہیں ہوا؟ امام غزالیؒ نے فرمایا سال پورا ہوا ہے یا نہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ سن کر حضرت نے فرمایا کہ کام پورا ہو گیا۔ اب کھجوریں لے کے جانے کی ضرورت

نہیں۔ اور انہوں نے غزالیؒ کو وہ علم جس کی تلاش میں وہ سالہا سال سے سرگرداں تھے منتقل کر دیا۔ امام غزالیؒ جب بغداد واپس پہنچے تو صورتحال یہ تھی کہ معمولی کپڑے زیب تن تھے۔ ہاتھ میں ایک ڈول تھا۔ ڈول میں رسی بندھی ہوئی تھی۔ شہر والوں کو جب علم ہوا کہ امام غزالیؒ واپس تشریف لا رہے ہیں تو ان کے استقبال کیلئے پورا شہر امنڈ آیا۔ لوگوں نے جب آپ کو ان پھٹے پرانے لباس میں دیکھا تو حیران و پریشان ہوئے۔ اور کہا، یہ آپ نے کیا صورت بنا رکھی ہے؟ امام غزالیؒ نے فرمایا۔ اللہ کی قسم! اگر میرے اوپر یہ وقت نہ آتا تو میری ساری زندگی ضائع ہو جاتی۔ امام غزالیؒ کے یہ الفاظ بہت فکر طلب ہیں۔ اپنے زمانے کا یکتا عالم فاضل دانشور یہ کہہ رہا ہے کہ یہ علم اگر حاصل نہ ہوتا جو تین سال تک سر پر چپت کھا کر حاصل ہوا ہے تو زندگی ضائع ہو جاتی۔

امام غزالیؒ اگر اس وقت جب ان سے کہا گیا تھا کہ سر پر ایک چپت کھانے کے بعد ایک کھجور تقسیم کرو، یہ سوال کر دیتے کہ جناب اس کی علمی توجیہ کیا ہے اور سر پر چپت کھانے سے رحانیت کیسے حاصل ہو سکتی ہے تو انہیں یہ علم حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

یہی صورت حال روحانی استاد (مراد) شاگرد (مرید) کی ہے۔ مرید کے اندر جب تک اپنی انا کا علم موجود ہے وہ مراد سے کچھ نہیں سیکھ سکتا۔

ہم جب کلمہ طیبہ پڑھتے ہیں تو پہلے اللہ کی نفی کرتے ہیں۔ پھر اللہ کا اقرار کرتے ہیں۔ لا الٰہ کوئی معبود نہیں۔ الا اللہ، مگر اللہ۔ اس کی عام تفسیر تو یہ ہے کہ حضور ﷺ کی بعثت کے زمانے میں بتوں کی پوجا ہوتی تھی۔ لوگ بتوں کو خدا مانتے تھے۔ لا الٰہ کا مفہوم یہ ہوا کہ یہ بت معبود نہیں مگر اللہ معبود ہے۔ لیکن باریک بین نظر اور گہرے تفکر اور سنجیدہ فہم سے غور کیا جائے تو اس کی تشریح یہ ہو گی کہ لا الٰہ ہمارے (شعوری) علوم کے احاطے میں اللہ کے جاننے کی جو طرز ہے ہم اس کی نفی کرتے ہیں۔ اور اللہ کو اس طرح تسلیم کرتے ہیں جس طرح اللہ خود کو اللہ کہتا ہے اور محمد ﷺ اللہ کے پیغامبر ہیں یعنی محمد ﷺ نے بحیثیت رسول اللہ ﷺ کو جس طرح بتایا ہم اسی طرح اللہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ پہلے ہم نے علم کی نفی کی، پھر علم کا اثبات کیا۔ جب علم کی نفی کی تو اپنی نفی کی اور جب اپنی نفی کی تو اپنی نفی کی تو اللہ کے سوا کچھ باقی نہ بچا۔

ہم جب کسی چیز کو اپناتے ہیں تو اس میں طرز فکر کو پہلے دخل ہوتا ہے۔ روحانیت کا اگر مجموعی پر کوئی دوسرا مترادف لفظ ہو سکتا ہے تو وہ دراصل طرز فکر ہے۔ چونکہ عام آدم طرز فکر قائم کرنے کے اصول و قواعد سے واقف نہیں ہوتا۔ اس لئے اسے ایسے آدمی کی تلاش ہوتی ہے جو طرز فکر قائم کرنے کے قانون سے واقفیت رکھتا ہو۔ ابتداء اس طرح ہوتی ہے کہ ایک بندے نے ایک ایسا بندہ تلاش کیا جس کی طرز فکر حضور ﷺ سے وابستہ ہے۔ اس کی قربت میں بندے کو وہی طرز فکر منتقل ہو جاتی ہے اور جب بندہ کی طرز فکر اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو

وہ حضور ﷺ کی طرز فکر سے قریب ہو جاتا ہے اور اس طرز فکر میں اتنی گہرائی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے قریب ہو جاتا ہے۔ حضور ﷺ کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرز فکر کام کر رہی ہے۔ حضور ﷺ کی طرز فکر سے قریب ہونے کے بعد بندہ اس طرز فکر سے قریب ہو جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی قربت کا ذریعہ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''میں چھپا ہوا خزانہ تھا، پس میں نے محبت کے ساتھ مخلوق کو تخلیق کیا تا کہ میں پہچانا جاؤں۔''

(حدیث قدسی)

زندگی میں اگر اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل ہو جاتا ہے تو زندگی کامیاب ہے ورنہ پوری زندگی خسارے اور نقصان کے علاوہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

احسن الخالقین

سوال: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "میں تخلیق کرنے والوں میں بہترین خالق ہوں۔" اس آیت مبارکہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ تخلیق کا وصف اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور بھی کسی کو حاصل ہے۔ اگر یہ وصف اللہ کے علاوہ بھی کسی کو حاصل ہے تو اس کی کیا حیثیت ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت تخلیق میں کوئی ان کا ثانی نہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے جہاں کائنات کی تخلیق کا تذکرہ کیا ہے وہاں یہ بات ارشاد کی ہے کہ "میں تخلیق کرنے والوں میں سب سے بہتر ہوں۔" اللہ تعالیٰ نے بحیثیت خالق کے ایک ایسے خالق ہیں کہ جن کی تخلیق میں وسائل کی پابندی زیر بحث نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ کے ارادے میں جو چیز جس طرح اور جس خدوخال میں موجود ہے، جب وہ اس چیز کو وجود بخشنے کا ارادہ کرتے ہیں تو حکم دیتے ہیں اور اس کی حکم کی تعمیل کے لئے تخلیق کے اندر جتنے وسائل ضروری ہیں وہ سب وجود میں آکر اس تخلیق کو عمل میں لے آتے ہیں۔

"خالقین" کا لفظ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور بھی تخلیق کرنے والے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے علاوہ دوسری ہر تخلیق وسائل کی پابند اور محتاج ہے اس کی مثال آج کے دور میں بجلی سے دی جا سکتی ہے۔ جب بندوں نے بجلی سے دوسری ذیلی تخلیقات کو وجود میں لانا چاہا تو اربوں کھربوں چیزیں وجود میں آ گئیں۔

اللہ تعالیٰ کا یہ وصف ہے کہ اللہ نے ایک لفظ "کن" کہہ کر بجلی کو وجود بخش دیا۔ آدم نے اختیار طور پر جب بجلی کے علم کے اندر تفکر کیا اس بجلی سے ہزاروں چیزیں وجود میں آگئیں۔ بجلی سے جو چیزیں وجود میں آئیں وہ انسان کی تخلیق ہیں۔ مثلاً ریڈیو، ٹی وی اور بے شمار دوسری چیزیں۔ روحانی نقطۂ نظر سے اللہ کی اس تخلیق میں سے دوسری ذیلی تخلیقات کا مظہر بننا دراصل آدم زاد کا بجلی کے اندر تصرف ہے۔ یہ وہی علم ہے جو اللہ تعالیٰ نے آدم کو سکھا دیا تھا۔ "علم الاسماء" سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو ایک ایسا علم سکھا دیا کہ جو براہ راست تخلیقی فارمولوں سے مرکب ہے۔ جب انسان اس علم کو گہرائی کے اندر جا کر حاصل کرتا ہے اور اس علم کے ذریعے تصرف کرتا ہے تو نئی نئی چیزیں وجود میں آجاتی ہیں۔

کائنات دراصل علم ہے، ایسا علم جس کی بنیاد اور حقیقت سے اللہ تعالیٰ نے بندوں کو واقف کر دیا ہے لیکن اس وقوف کو حاصل کرنے کے لئے ضروری قرار دے دیا گیا ہے کہ بندے علم کے اندر تفکر کریں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے کہ ہم نے لوہا نازل کیا اور اس کے اندر لوگوں کے لئے بے شمار فائدے

محفوظ کر دیئے۔

جن لوگوں نے لوہے (بمعنی دھات) کی حیثیت اور طاقت کو تسلیم کر کے لوہے کے اندر گہرائی میں تفکر کیا تو لوہے کی لامحدود صلاحیتیں سامنے آگئیں اور جب ان صلاحیتوں کو استعمال کر کے لوہے کے اجزائے ترکیبی کو متحرک کر دیا تو لوہا ایک ایسی عظیم شئے بن کر سامنے آیا کہ جس سے موجودہ سائنس کی ہر ترقی کسی نہ کسی طرح وابستہ ہے۔ یہ ایک تصرف ہے جو وسائل میں کیا جاتا ہے یعنی ان وسائل میں جن وسائل کا ظاہر وجود ہمارے سامنے ہے۔ جس طرح لوہا ایک وجود ہے اسی طرح روشنی کا بھی ایک وجود ہے۔ وسائل کی حدود سے گزر کر یا وسائل کے علوم سے آگے بڑھ کر جب کوئی بندہ روشنیوں کا علم حاصل کر لیتا ہے تو بہت ساری تخلیقات وجود میں لاسکتا ہے۔ وسائل میں محدود رہ کر ہم سونے کے ذرات کو اکٹھا کر کے ایک خاص پروسیس سے گزار کر سونا بناتے ہیں۔ لوہے کے ذرات اکٹھا کر کے خاص پروسیس سے گزار کر ہم لوہا بناتے ہیں لیکن وہ بندہ جو روشنیوں میں تصرف کرنے کا اختیار رکھتا ہے اس کے لئے سونے کے ذرات کو مخصوص پروسیس سے گزارنا ضروری نہیں ہے۔ وہ اپنے ذہن میں روشنیوں کا ذخیرہ کر کے ان مقداروں کو الگ کر لیتا ہے جو مقداریں سونے کے اندر کام کرتی ہیں اور ان مقداروں کو ایک لفظ پر مرکوز کر کے ارادہ کرتا ہے ''سونا'' اور سونا بن جاتا ہے۔

ہم بتا چکے ہیں کہ اللہ تعالٰی اپنی تخلیق میں کسی کے محتاج نہیں ہیں۔ جب وہ کوئی چیز تخلیق کرتے ہیں تو تخلیق کے لئے جتنے وسائل موجود ہونا ضروری ہیں وہ خودبخود موجود ہو جاتے ہیں۔ بندے کا تصرف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالٰی کی بنائی ہوئی تخلیق میں تصرف کرتا ہے۔ اس تصرف کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ وسائل میں محدود رہ کر وسائل کو مجتمع کر کے کوئی نئی چیز بنانا اور دوسرا طریقہ روشنیوں میں تصرف کرنا ہے۔ یعنی کوئی چیز جن روشنیوں پر قائم ہے۔ ان روشنیوں کو متحرک کر کے کسی چیز کو تخلیق کرنا۔ روحانی دنیا میں ان روشنیوں کا نام نسمہ اور سائنسی دنیا میں ان رشنیوں کا نام اورا (AURA) ہے۔ جب کوئی بندہ روشنیوں کے اس علم کو جان لیتا ہے تو اس کے اوپر تخلیقی فارمولے واضح ہونے لگتے ہیں۔

انسان اللہ تعالٰی کی ایک ایسی تخلیق ہے جو اللہ تعالٰی کی تخلیق میں تصرف کرنے کی قدرت رکھتی ہے اور یہ علم اسے اللہ تعالٰی کی طرف سے منتقل ہوا ہے۔ اللہ تعالٰی چونکہ یہ بات جانتے ہیں کہ انسان سے ذیلی تخلیقات وجود میں آتی رہیں گی اس لئے اللہ تعالٰی نے اپنے لئے احسن الخالقین ارشاد فرمایا ہے۔

سوال: روحانی شاگرد کو روحانی استاد کی طرز فکر کس طرح حاصل ہوتی ہے۔

جواب: روحانی استاد یا مراد انبیاء کی طرز فکر کا وارث ہوتا ہے۔ جب کوئی شاگرد اپنے روحانی استاد کی طرز فکر حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ وہ استاد کی نسبت حاصل کرے۔ نسبت حاصل کرنے کا پہلا سبق تصور ہے۔ جب روحانی شاگرد یا سالک آنکھیں بند کر کے ہر طرف سے ذہن ہٹا کر اپنے روحانی استاد کا تصور کرتا ہے تو روحانی استاد کے اندر کام کرنے والی لہریں اور طرز فکر منتقل ہونے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔

طرز فکر روشنیوں کا وہ ذخیرہ ہے جو حواس بناتی ہیں، شعور بناتی ہیں، زندگی کی ایک نہج بناتی ہیں۔ تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات موجود ہیں کہ جب کوئی روحانی شاگرد اپنے روحانی استاد کے تصور میں گم ہو جاتا ہے تو اس کی چال ڈھال انداز گفتگو اور شکل وصورت میں ایسی نمایاں مشابہت پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ پہچاننا مشکل نہیں رہتا کہ یہ اپنے روحانی استاد کا عکس ہے۔ تصور کا قاعدہ اور طریقہ یہ ہے کہ ایک وقت مقرر کر کے ذہن کو ہر طرف سے آزاد کر کے بند آنکھوں سے یہ سوچا جائے کہ روحانی استاد کی طرز فکر میں کام کرنے والی روشنیاں میرے اندر منتقل ہو رہی ہیں۔

سوال: روحانی علوم حاصل کرنے میں زیادہ وقت کیوں لگ جاتا ہے؟

جواب: روحانیت کے راستوں پر چلنے والے تمام طلباء کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ روحانی علوم دوسرے تمام علوم پر حاوی ہیں اور یہ کہ روحانی علوم لاشعوری صلاحیت کے تابع ہیں۔ ان علوم کے سیکھنے میں جو وقت لگتا ہے وہ شعور کے اندر سکت پیدا کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک چھوٹا بچہ اگر دو چھٹانک وزن اٹھانے کی سکت رکھتا ہے اور اس کے اوپر پانچ سیر وزن رکھ دیا جائے تو اس کو نقصان پہنچے گا۔ اسی طرح اگر آپ قاعدہ پڑھنے والے بچے سے یہ توقع رکھیں کہ وہ بڑی کلاسوں کے سوال حل کرے گا تو یہ عقلمندی کی بات نہیں ہوگی۔ بچہ کے اندر جیسے جیسے سکت پیدا ہوتی ہے علوم کے دروازے کھلتے رہتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ پہلی جماعت کا علم حاصل کرنے میں اتنا وقت نہیں لگتا جتنا وقت پی۔ ایچ۔ ڈی (Ph.D) کرنے میں لگتا ہے۔

سوال: تصورات جسم پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اور تصورات کی پیچیدگی سے انسان کس طرح پریشان

اور بیمار ہو جاتا ہے۔تصورات کہاں سے آتے ہیں؟

جواب: انسانی زندگی تین دائروں میں تقسیم ہے۔ مادی، ذہنی اور ماورائے، ذہنی مادی دائرے کا طبیعات سے تعلق ہے۔ذہنی دائرے کا نفسیات سے اور ماورائے ذہنی دائرے مابعد النفسیات یا پیرا سائیکلوجی سے متعلق ہیں۔

مابعد النفسیات میں طبیعات اور نفسیات سے ہٹ کر ان ایجنسیوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو کائنات کی مشترک سطح میں عمل پیرا ہیں اور کائنات کے قوانین عمل کا احاطہ کرتی ہیں۔علم مابعد النفسیات (روحانیت) اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ انسان کائنات کی تخلیق میں کام کرنے والے فارمولوں سے کہاں تک مانوس ہے۔ یہ فارمولے اس کی دسترس میں ہیں یا نہیں اور ہیں تو کس حد تک ہیں۔ ہمارے لئے ان کی افادیت کیا ہے اور ان سے آگاہی حاصل کرکے کس طرح زندگی کو خوشگوار اور کامیاب بنایا جاسکتا ہے۔

اس حقیقت سے ایک فرد واحد بھی انکار نہیں کرسکتا کہ انسان کی زندگی میں خوشی اور غم کا تعلق براہ راست خیالات اور تصورات سے قائم ہے۔کوئی خیال ہمارے لئے مسرت آگیں ہوتا ہے اور کوئی خیال انتہائی کربناک۔ بیٹھے بیٹھے یہ خیال بجلی کی طرح کوند جاتا ہے کہ ہمارے یا ہماری اولاد کے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہ آجائے جیسے ہی خیال کی یہ رو دماغ سے ٹکراتی ہے، حادثات سے متعلق پریشانیاں کڑی در کڑی آدمی اپنے اندر محسوس کرنے لگتا ہے۔یہی حال خوشی اور خوش حال زندگی کا ہے۔جب انسانی تصورات ایسے نقطۂ پر مرکوز ہو جاتے ہیں جس میں شادمانی اور خوش حالی کی تصویریں موجود ہوں تو انسان خوش ہو جاتا ہے۔خوشی اور غم دونوں تصورات سے وابستہ ہیں اور تصورات خیالات سے جنم لیتے ہیں۔اب یہ تلاش کرنا ضروری ہو گیا کہ خیالات کیسے بنتے ہیں اور کہاں سے آتے ہیں۔

روحانیت (مابعد النفسیات) کا قانون ہمیں بتاتا ہے کہ انسان تین پرت کا مجموعہ ہے۔ صفات، ذات اور تیسرا پرت ذات اور صفات میں امتیازی خط کھینچے والی ایجنسی۔امتیازی خط کھینچنے والی ایجنسی کو تخلیط یا جسد خاکی کہتے ہیں۔جسد خاکی اس پتلے کا نام ہے جس کو عرف عام میں آدمی کہا جاتا ہے۔ ہر پرت کے محسوسات ایک دوسرے سے بالکل الگ اور نمایاں ہیں۔ذات کا پرت وہ نقش ہے جو وہم اور خیال کو تصور بنا کر ذہن میں منتقل کردیتا ہے۔ذہن تصورات کو معانی کا لباس پہنا کر خوشی یا غم کا مفہوم دیتا ہے۔اگر اس کو ایسی معلومات فراہم کی جائیں جو کسی خوبصورت باغ سے تعلق رکھتی ہوں تو اس کے اندر رنگین روشنیاں، خوشبو کے طوفان اور حسن کے تصورات رونما ہونے لگتے ہیں۔

ذہن میں دو قسم کے نقوش ہوتے ہیں۔ایک نقش باطن جس کے اندر بہت لطیف انوار کا ذخیرہ رہتا

ہے۔ دوسرا نقش ظاہر جس کے اندر خود غرضی، ذہنی تعیش، تنگ ظرفی، احساس کمتری یا احساس برتری اور غیر ذمہ داری جیسے کثیف جذبات کا ذخیرہ ہوتا ہے۔تصورات میں اگر پیچیدگی اور بناوٹ ہے تو یہ الجھن، اضطراب، بے چینی، ڈر اور خوف کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ان کو زیادتی نقش ظاہر کو نقش باطن سے دور کر دیتی ہے اور یہ دوری بہت سے امراض پیدا کر دیتی ہے۔مثلاً مرگی، دماغی فتور کا عارضہ، آسیب، خفقان، کینسر، سل اور دق وغیرہ۔

عرف عام میں رگ پٹھوں کی بناوٹ اور ہڈیوں کے ڈھانچے کو انسان کہا جاتا ہے۔دراصل یہ انسان وہ نہیں ہے جس کو قدرت انسان کہتی ہے۔گوشت پوست، رگ پٹھوں سے مرکب انسان کو ہم اصل انسان کا لباس کہہ سکتے ہیں۔

مثال:

آپ ایک قمیض لیجئے۔اگر آپ چاہیں کہ قمیض جسم سے الگ بھی حرکت کرے تو یہ ممکن نہیں ہے۔جب تک قمیض جسم کے اوپر ہے جسم کی حرکت کے ساتھ اس کے اندر بھی حرکت موجود ہے۔اگر آستین ہاتھ کے اوپر ہے تو اس کے اندر ہاتھ کی حرکت کے ساتھ حرکت پیدا ہونا لازمی ہے۔ہاتھ سے الگ آستین میں حرکت پیدا ہونا بعدی از قیاس ہے۔یہی حال جسم کا بھی ہے۔اگر جسم کسی دوسرے جسم (روح) کے اوپر موجود ہے تو اس کے اندر حرکت ہے ورنہ کوئی حرکت نہیں ہے۔انسان جب مر جاتا ہے تو اس کے اندر اپنی کوئی مدافعت باقی نہیں رہتی۔آپ مرے ہوئے جسم کے ساتھ کچھ بھی کیجئے، جلا دیجئے، قبر میں دفن کر دیجئے، ایک ایک عضو الگ کر دیجئے، جسم کی طرف سے کوئی حرکت، کوئی مدافعت عمل میں نہیں آئے گی۔

بتانا یہ ہے کہ گوشت پوست اور رگ پٹھوں سے بنا ہوا جسم انسان نہیں ہے بلکہ انسان کا لباس ہے۔ جب تک انسان یعنی روح موجود ہے لباس بھی موجود ہے۔جیسے ہی انسان اس لباس سے قطع تعلق کرتا ہے (جس کو ہم مرنا کہتے ہیں) اس کے اندر کوئی حرکت باقی نہیں رہتی۔

قرآن پاک کے ارشاد کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ہر شئے کو معین مقداروں پر تخلیق کیا ہے۔بالفاظ دیگر زندگی معین مقداروں پر سرگرم عمل ہے۔یہ مقداریں ہی وہم، خیال، تصورات اور احساس مبنی ہیں۔ان مقداروں میں کمی بیشی یا شکست و ریخت واقع ہو جائے تو زندگی غیر متوازن ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان نت نئی پریشانیوں، الجھنوں اور بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

سوال: یادداشت کیوں کمزور ہوجاتی ہے؟ اس کمزوری کو دور کرنے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟

جواب: اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ قانون کے مطابق ہر چیز کے دو رخ ہوتے ہیں۔ اس قانون کے مطابق دماغ کے بھی دو رخ ہیں۔ ایک رخ وہ حصہ ہے جو سر کے سیدھی طرف ہے، دوسرا رخ وہ جو سر کے بائیں طرف ہے۔ دونوں حصے یا دونوں دماغ ہر وقت کام کرتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ایک حصہ کی کارگزاری بیداری کے حواس بناتی ہے اور دوسرے حصہ کی کارگزاری سے رات کے حواس بنتے ہیں۔

سیدھی طرف کا دماغ شعور ہے اور الٹی طرف کا دماغ لاشعور ہے جب تک کوئی بات یا کوئی عمل صرف شعور کے دائرہ کار میں رہتا ہے وہ چیز زیادہ دیر محفوظ نہیں رہتی۔ یہ چیز دلچسپی اور بھول کے خانے میں جا پڑتی ہے۔ اگر کوئی کام، کوئی عمل شعور کی سطح سے گزر کر لاشعور میں داخل ہوجاتا ہے تو یہ کام فہم و فراست کے ساتھ حافظہ کے اوپر نقش ہوجاتا ہے۔

ہم جب کوئی سبق، کوئی کتاب، کورس کا کوئی مضمون سطحی طور پر پڑھتے ہیں، اس میں سبق کو رٹنا بھی شامل ہے، تو شعور کی سطح سے وہ آگے نہیں بڑھتا۔ لیکن اگر ہم یہی سبق غور و فکر اور سمجھ بوجھ کے ساتھ پڑھتے ہیں تو وہ لاشعور کی حدود میں چلا جاتا ہے تو اس کا مفہوم یاد رہتا ہے۔ آج کل اکثر طلبہ و طالبات کی یہ عادت بن گئی ہے کہ وہ سمجھ کر پڑھنے کے بجائے اپنی صلاحیتیں حفظ کرنے میں خرچ کردیتے ہیں۔ جب تک اس سبق کو وہ دہراتے رہتے ہیں، یاد رہتا ہے اور جب دہرانا ترک کردیتے ہیں، حافظہ میں نہیں رہتے اور امتحان میں متوقع نتائج سامنے نہیں آتے اور جب دماغ پر زور ڈالا جاتا ہے تو تھکن کے احساس میں شدت آجاتی ہے۔

اس کا علاج بہت سہل اور آسان ہے۔ وقت مقرر کرکے پڑھنے کے اوقات میں پڑھا جائے اور کھیل کود کے اوقات میں دوسرا کوئی کام نہ کیا جائے۔

روحانی طرزوں میں شعور اور لاشعور کو متوازن کرنے کے لئے بہترین عمل ہر وقت باوضو رہنا ہے لیکن اس عمل میں انتہاپسندی کا عمل دخل نہیں ہونا چاہئے۔

بول و براز اور دوسری ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اپنے اوپر جبر نہ کریں کیونکہ جبر کرنے سے دماغ کے اوپر بوجھ پڑتا ہے۔ طبعی تقاضے پورے کرنے کے بعد دوبارہ وضو کرلیا جائے۔

سوال: دل کی تصویر لانے کی کوشش کریں۔ یا روشنی اور نور کی شبیہ دیکھنے کی کوشش کریں؟ یا پھر خود کو ترغیب دیں کہ یہ چیزیں ہماری بند آنکھوں کے سامنے ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے تو تصور سے کیا مراد ہے؟

جواب: تصور کی صحیح تعریف جاننے کے لئے دو بنیادی باتوں کا سمجھنا ضروری ہے۔ پہلی بات یہ کہ کسی چیز کی معنویت ہمارے اوپر اسی وقت آشکار ہوتی ہے جب ہم اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ کوئی چیز ہمارے سامنے ہے لیکن ذہنی طور پر ہم اس کی طرف متوجہ نہیں ہیں تو وہ چیز ہمارے لئے بسا اوقات کوئی معنی نہیں رکھتی۔ مثلاً ہم گھر سے دفتر جاتے ہیں۔ دفتر پہنچنے کے بعد اگر ہم سے کوئی صاحب پوچھیں کہ آپ نے راستے میں کیا کیا چیزیں دیکھیں ہیں تو ہم یہی کہیں گے کہ ہم نے اس طرف دھیان نہیں دیا۔ حالانکہ یہ ساری چیزیں ہماری نظروں کے سامنے سے گزری ہیں۔

دوسری اہم بات دلچسپی اور ذوق و شوق ہے۔ ہم کوئی دلچسپ کتاب پڑھتے ہیں تو ہمیں وقت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس کوئی غیر دلچسپ مضمون پڑھ کر ہم چند منٹ میں ہی ذہنی بوجھ اور کوفت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ذہنی مرکزیت کے ساتھ ساتھ اگر دلچسپی اور ذوق و شوق بھی ہے تو کام آسان ہو جاتا ہے۔

مراقبہ یا تصور کی مشقوں سے بھرپور فائدہ حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ صاحب مشق جب آنکھیں بند کر کے تصور کرے تو خود سے اور ماحول سے بے نیاز ہو جائے، اتنا بے نیاز کہ اس کے اوپر سے بتدریج ٹائم اور اسپیس کی گرفت ٹوٹنے لگے یعنی تصور میں اتنا انہماک ہو جائے کہ وقت گزرنے کا مطلق احساس نہ رہے۔

سوال: روحانیت میں اکثر قطب، غوث، ابدال وغیرہ کی اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں۔ ان کا کیا مطلب ہے اور کسی بزرگ کا قطب، غوث، ابدال یا کسی اور رتبہ پر فائز ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے کہ میں نے آدم کو زمین میں اپنا نائب اور خلیفہ مقرر کیا ہے۔ آدم کو نیابت اور خلافت اس وقت منتقل ہوئی اور وہ مسجود ملائک ٹھہرے جب اللہ تعالیٰ نے آدم کے اندر اپنی روح پھونکی اور ''علم الاسماء'' سکھایا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کائنات کے انتظامی امور کو سمجھنا اور اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے علم الاسماء کی روشنی میں ان انتظامی امور کو چلانا نیابت کے دائرے میں آتا ہے۔ انسان کو بحیثیت خلیفۃ اللہ علم الاسماء کی حکمت تکوین کے اسرار و رموز اس لئے سکھائے گئے کہ وہ نظامت کائنات کے امور میں نائب کے فرائض پورے کر سکے۔

اوتار، طلب، غوث، ابدال وغیرہ یہ کائناتی نظام تکوین کا کام کرنے والے حضرات کے عہدوں کے نام ہیں۔ یہ حضرات اپنے عہدے اور علم کے مطابق تکوینی امور (Administration) سرانجام دیتے

ہیں۔علم الاسماء سے واقفیت اور تکوینی عہدے پر فائز ہونا اللہ تعالیٰ کا کسی بندے پر فضل و کرم اور انعام ہے۔ سورۂ کہف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ایک بندے کا واقعہ بیان ہوا ہے۔اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک ایسے بندے سے متعارف کرایا ہے جو نظام تکوین کا رکن تھا۔عرف عام میں اس بندے کو حضرِ خضر علیہ السلام کہا جاتا ہے۔

سوال: مراقبہ کی مشق تلقین کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ فلاں تصور کیا جائے مثلاً دل کے اندر جھانکنے کو کہا جاتا ہے یا یہ بتایا جاتا ہے کہ آنکھیں بند کر کے روشنی اور نور کا تصور کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔کیا اس تصور سے مراد ہے کہ ہم اپنی بند آنکھوں کے سامنے ذوق وشوق پر قائم ہے۔دلچسپ مضمون پڑھنے کی مثال دی جا چکی ہے۔

جواب: تصور کیا جا رہا ہو تو نور کو دیکھنے کی کوشش نہ کریں بلکہ صرف نور کا خیال کریں۔نور جو کچھ بھی ہے اور جس طرح بھی ہے از خود سامنے آئے گا۔اصل مدعا کسی ایک طرف دھیان کر کے ذہنی یک سوئی حاصل کرنا اور منتشر خیالی سے نجات پانا ہے۔اس کے بعد باطنی کم کڑی در کڑی از خود ذہن پر منکشف ہونے لگتا ہے۔تصور کا مطلب اس بات سے کافی حد تک پورا ہوتا ہے۔جس کو عرف عام میں ''بے خیال ہونا'' کہا جاتا ہے۔

اگر ہم کھلی یا بند آنکھوں سے کسی چیز کا تصور کرتے ہیں اور تصور میں خیالی تصریر بنا کر اسے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ عمل ذہنی یک سوئی کے دائرے میں نہیں آتا۔ذہنی یکسوئی سے یہ مراد ہے کہ آدمی شعوری طور پر دیکھنے اور سننے کے عمل سے بے خبر ہو جائے۔

قانون یہ ہے کہ آدمی کسی لمحے بھی حواس سے آزاد نہیں ہوتا۔جب ہمارے اوپر شعوری حواس کا غلبہ نہیں رہتا تو لازمی طور پر لاشعوری حواس متحرک ہو جاتے ہیں۔

سوال: مشہور بزرگ حضرت بابا تاج الدین ناگپوریؒ کی کرامت یوں درج ہے کہ ایک شخص نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا کہ مجھے اجمیر شریف جانے کی اجازت دی جائے۔بابا صاحب نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ کہاں جاتے ہو۔اجمیر یہیں ہے۔اسی لمحے اس شخص نے دیکھا کہ وہ اجمیر میں موجود ہے اور وہاں کی سیر کر رہا ہے۔ازراہ کرم اس بات پر روشنی ڈالیں کہ ایسا کیوں کر ہوا۔

جواب: اس کرامت کے اصول کو سمجھنے کے لئے انسانی ذات اور زمان و مکان پر مختصر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

انسان کی اپنی ذات کا ایک حصہ داخلی ہے اور دوسرا خارجی۔ داخلی حصہ وحدت ہے جہاں زمانیت ہے نہ مکانیت۔ احساس کے صرف تین حصے شاہد، مشہود اور مشاہدہ پائے جاتے ہیں۔ ذات کے خارجی حصے میں یہی احساس، زمانیت اور مکانیت دونوں کو احاطہ کر کے ٹھوس شکل میں ظاہر کرتا ہے۔ کسی شخص کا باطن جو اس کی اپنی ذات ہے امرِ ربی یا روح کہلاتا ہے اور روح میں کائنات کے تمام اجزاء اور اس کی حرکتیں منقوش اور موجود ہیں۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھئے۔ ہم کسی عمارت کی ایک سمت میں کھڑے ہو کر اس عمارت کے ایک زاویہ کو دیکھتے ہیں۔ جب عمارت کے دوسرے زاویے کو دیکھنا ہوتا ہے تو چند قدم چل کر اور کچھ فاصلہ طے کر کے ایسی جگہ کھڑے ہو جاتے ہیں جہاں سے عمارت کے دوسرے رخ پر نظر پڑتی ہے۔ نگاہ کا زاویہ تبدیل کرنے میں چند قدم کا فاصلہ طے کرنا پڑا اور فاصلہ طے کرنے میں تھوڑا سا وقفہ بھی صرف ہوا۔ اس طرح نظر کا ایک زاویہ بنانے کے لئے مکانیت اور زمانیت دونوں وقوع میں آئیں۔ ذرا وضاحت سے اس بات کو ہم یوں بیان کر سکتے ہیں کہ جب ایک شخص لندن ٹاور کو دیکھنا چاہے تو کراچی سے سفر کر کے اسے لندن جانا پڑے گا۔ ایسا کرنے میں اسے ہزاروں میل کی مکانیت اور کئی دنوں کا زمانہ لگانا پڑے گا۔ اب نگاہ کا وہ زاویہ بنا جس سے لندن ٹاور دیکھا جا سکتا ہے۔ مقصد صرف نگاہ کا وہ زاویہ بنانا تھا جس سے لندن ٹاور کو دیکھا جا سکے۔ یہ انسانی ذات کے خارجی حصے کا زاویہ نگاہ ہے۔ اگر ذات کے داخلی زاویۂ نگاہ سے کام لیا ہو تو ہم اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے لندن ٹاور کا تصور کر سکتے ہیں۔ تصور کرنے میں جو نگاہ استعمال ہوتی ہے وہ اپنی توانائی کی وجہ سے ایک دھندلا سا خاکہ دکھاتی ہے۔ لیکن وہ زاویہ یہ ضرور بنا دیتی ہے جو ایک طویل سفر کر کے لندن ٹاور پہنچنے کے بعد ٹاور کو دیکھنے میں بنتا ہے۔ اگر کسی طرح نگاہ کی ناتوانی دور ہو جائے تو زاویۂ نگاہ کا دھندلا خاکہ روشن اور واضح نظارے کی حیثیت اختیار کر سکتا ہے۔ اور دیکھنے کا مقصد بالکل اسی طرح پورا ہو جائے گا جس طرح سفر کے بعد پورا ہوتا ہے۔ اصل چیز زاویۂ نگاہ کا حصول ہے، جس طرح بھی ممکن ہو۔

بابا تاج الدین ناگپوریؒ نے اپنی قوت تصرف سے سائل کے اندر ایک مخصوص زاویۂ نگاہ پیدا کر کے ذہنی نظارے کو جلا بخشی۔ اس طرح سائل نے اجمیر کو بالکل اسی طرح دیکھا جس طرح ایک طویل سفر کے بعد وہ اجمیر پہنچ کر وہاں کے مناظر دیکھتا۔

سوال: روحانی نقطۂ نظر سے مختلف امراض کیوں پیدا ہوتے ہیں؟

جواب: عام طور سے گوشت پوست سے مرکب جسم اور ہڈیوں کے پنجرے پر رگ اور پٹھوں کی بناوٹ کو انسان کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ یہ ہے کہ درحقیقت گوشت پوست کا جسم انسان کہلانے کا

مستحق نہیں ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان پر جب وہ کیفیت وارد ہوتی ہے جس کا نام موت ہے تو جسم کے اندر فوری طور پر کوئی تبدیلی رونما نہ ہونے کے باوجود جسم ہر قسم کی حرکات وسکنات سے محروم ہو جاتا ہے۔ بات واضح ہے کہ جس چیز پر جسم کی حرکات وسکنات کا دارومدار تھا اس نے جسم سے رشتہ منقطع کر لیا۔ اب ہم یوں کہیں گے کہ انسان دراصل وہ ہے جو اس گوشت پوست کے جسم کو حرکت دیتا ہے۔ عرف عام میں اسے ''روح'' کہا جاتا ہے۔ روح کیا ہے؟ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ ''روح'' امر رب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ انسان ناقابل تذکرہ شئے تھا۔ ہم نے اس کے اندر اپنی روح پھونک دی۔ یہ دیکھتا، سنتا، سونگھتا اور محسوس کرتا انسان بن گیا۔

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی تخلیق کے فارمولے بنائے ہیں اور ہر فارمولا معین مقداروں کے تحت کام کر رہا ہے۔ تیسویں پارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''ہم نے ہر چیز کو معین مقداروں سے تخلیق کیا ہے۔''

ہم یہ بتا چکے ہیں کہ اصل انسان روح ہے۔ ظاہر ہے کہ روح اضطراب، کشاکش، احساس محرومی اور بیماریوں سے ماوراء ہے۔ روح اپنے اور جسم کے درمیان ایک میڈیم بناتی ہے۔ اس میڈیم کو ہم جسم انسانی اور روح کے درمیان نظر نہ آنے والا انسان کہہ سکتے ہیں۔ یہ غیر مرئی انسان بھی بااختیار ہے۔ اس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ روح کی فراہم کردہ اطلاعات کو اپنی مرضی سے معانی پہنا دے۔ جس طرح معین فارمولے کام کرتے ہیں اسی طرح روح اور جسم کے درمیان نظر نہ آنے والا جسم بھی فارمولوں کے تحت متحرک اور باعمل ہے۔ اس میں اربوں، کھربوں فارمولے کام کرتے ہیں۔ جن کو ہم چار عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ واٹر انرجی (WATER ENERGY)

۲۔ الیکٹرک انرجی (ELECTRIC ENERGY)

۳۔ ہیٹ انرجی (HEAT ENERGY)

۴۔ ونڈ انرجی (WIND ENERGY)

انسان کے اندر دو دماغ کام کرتے ہیں:

دماغ نمبر ا براہ راست اطلاعات قبول کرتا ہے اور

دماغ نمبر ۲ ان اطلاعات میں اپنے مفاد کے مطابق یا غیر واضح اور تخریبی معانی پہنانے کا عادی ہو جاتا ہے تو معین مقداروں میں سقم واقع ہونے لگتا ہے اور مذکورہ بالا توانائیاں اپنے صحیح خدوخال کھو بیٹھتی ہے۔ ان توانائیوں میں تراش خراش یا اضافہ ہونے سے دونوں ہی صورتوں میں جسم کے اندر مختلف امراض جنم لیتے ہیں۔

تصوف اور صحابہ کرام

سوال: روحانیت اور تصوف کے حوالہ سے اولیاء اللہ کی کرامات اور کشف کا تذکرہ بڑی شد و مد سے کیا جاتا ہے جبکہ یہ بات حقیقت ہے کہ حضرات صحابہؓ کرام اور صحابیاتؓ امت محمدیہ میں سب سے افضل ہیں۔ اور کوئی ولی رتبہ میں کسی صحابی سے بلند مرتبہ نہیں ہو سکتا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ سے کرامات، کشف اور خرق عادات کا ظہور نہیں ہوا۔ اور اولیاء اللہ سے ہر زمانہ میں کرامات ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔

روحانیت میں مراقبہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ صحابہؓ کرامؓ اور صحابیاتؓ نے مراقبے کیوں نہیں کئے؟

درخواست ہے کہ اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر سے حقائق بیان کریں۔

جواب: اللہ کے حبیب رحمت اللعالمین علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''میں چھپا ہوا خزانہ تھا۔ میں نے محبت کے ساتھ مخلوق کو پیدا کیا تا کہ مخلوق مجھے پہچانے۔''

(حدیث قدسی)

اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اپنی محبت خاص سے اس لئے پیدا کیا تا کہ مخلوق اسے پہچانے اس سے واقف ہو۔ اس کی کبریائی اور عظمت کا اقرار و اعتراف کرے۔ چونکہ مخلوق میں سب سے افضل تخلیق انسان ہے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنا نائب اور خلیفہ بنایا۔ انسان کی سرکشی اور نافرمانی کے پیش نظر ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر مبعوث ہوئے۔

امتوں میں سب سے افضل نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امت ہے اور اس امت میں سب سے افضل لوگ صحابہ کرامؓ ہیں۔

روحانیت کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کو پہچاننا ہے اس کا عرفان حاصل کرنا ہے مگر اللہ تعالیٰ کو پہچاننے سے پہلے انسان کو خود کو پہچاننا ضروری ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے:

''من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ''

یعنی جو شخص اپنی ذات کا عرفان حاصل کر لیتا ہے وہ خداوند قدوس کو پہچان لیتا ہے۔

صحابہ کرامؓ کی واردات قلبی اور روحانی کیفیات کے بارے میں ابدال حق، حضرت قلندر بابا اولیاءؒ لوح وقلم میں ارشاد فرماتے ہیں:

''ذات باری تعالیٰ سے نوع انسانی یا نوع اجنہ کا ربط دو طرح پر ہے

ایک جذب کہلاتی ہے اور دوسری علم۔ صحابہ کرامؓ کے دور میں اور قرونِ اولٰی میں جن لوگوں کو مرتبہ احسان (مرتبہ احسان یہ ہے کہ بندہ یہ محسوس کرے اور دیکھے کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے اور بندہ یہ دیکھے اور محسوس کرے کہ وہ بندہ اللہ کو دیکھ رہا ہے) حاصل تھا۔ ان کے لطائف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت سے رنگین تھے۔ انہیں ان دونوں قسم کے ربط کا زیادہ علم نہیں تھا ان کی توجہ زیادہ تر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق غور وفکر میں صرف ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے روحانی قدروں کے جائزے زیادہ نہیں لئے کیونکہ ان کی روحانی تشنگی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اقوال پر توجہ صرف کرنے سے رفع ہو جاتی تھی۔ ان کو احادیث میں بہت زیادہ شغف تھا۔ اس انہماک کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کے ذہن میں احادیث کی صحیح ادبیت، ٹھیک ٹھاک مفہوم اور پوری گہرائی موجود تھی۔ احادیث پڑھنے کے بعد اور احادیث سننے کے بعد وہ احادیث کے انوار سے پورا استفادہ کرتے تھے۔ اس طرح انہیں الفاظ کے نوری تمثلات کی تلاش کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ وہ الفاظ کے نوری تمثلات سے بغیر کسی تعلیم اور بغیر کسی کوشش کے روشناس تھے۔ مجھے عالم بالا کی طرف رجوع کرنے کے مواقع حاصل ہوئے تو میں نے دیکھا کہ صحابۂ کرام کی ارواح میں ان کے ''عین'' قرآن پاک کے انوار اور احادیث کے انوار یعنی نورِ قدس اور نورِ نبوت سے لبریز ہیں۔ جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ ان کو لطائف کے رنگین کرنے میں جدوجہد نہیں کرنا پڑتی تھی اس دور میں روحانی قدروں کا ذکر وفکر نہ ہونا اس قسم کی چیزوں کے تذکروں میں نہ پایا جانا غالباً اس ہی وجہ سے ہے۔''

ابدال حق حضرت قلندر بابا اولیاءؒ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ صحابۂ کرامؓ کے دور میں پچیس (۲۵) فیصد لوگ روحانی ہوتے تھے جبکہ قحط الرجال کے اس دور میں گیارہ (۱۱) لاکھ آدمیوں میں ایک آدمی پوری طرح روحانی صلاحیتوں سے واقف ہوتا ہے۔

عام طور سے لوگ کرامات کو ہی روحانیت سمجھتے ہیں جبکہ یہ بات ہمارے سامنے ہے کہ جس شخص سے خرق عادت کا ظہور ہو وہ ہی روحانی آدمی سمجھا جاتا ہے۔ خرق عادات اور کرامات غیر مسلم حضرات سے بھی صادر ہوتی ہیں۔

عامۃ المسلمین کے ذہنوں سے یہ غلط فہمی دور کرنے کے لئے صحابۂ کرامؓ سے کرامات ظہور نہیں ہوئیں۔ اسلام کی مستند کتابوں سے صحابہ کرامؓ کی کرامات درج کی جا رہی ہیں۔

کرامات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت سیدنا ابوبکر صدیقؓ

امام مالک رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے جناب عائشہ کو بیس وسق تقریباً پانچ من کھجوریں ہبہ کی تھیں اور اپنی وفات سے پہلے ہی فرمایا۔ اے میری بیٹی! مال و دولت کے باب میں مجھے تم سے زیادہ کوئی پیارا نہیں اور مجھے تمہاری حاجت مندی بھی پسند ہے۔

لاریب بیس وسق کھجوریں میں نے تمہیں ہبہ کی تھیں۔ اگر تم نے انہیں توڑ کر اکٹھا کر لیا ہوتا تو وہ تمہاری مملوکہ ہو جاتیں لیکن اب وہ تمام وارثوں کا مال ہے۔ جس میں تمہارے دو بھائی اور تمہاری دو بہنیں شریک ہیں۔ بس اس کو قرآن کریم کے احکام کے موافق تقسیم کر لو۔ جس پر حضرت عائشہؓ نے کہا۔ ابا جان! اگر بہت زیادہ بھی ہوتیں تب بھی اس ہبہ سے دستبردار رہو جاتی لیکن یہ تو فرمائیے کہ میری بہن تو صرف ''اسما'' ہے یہ دوسری بہن کون ہے؟ حضرت صدیق اکبرؓ نے جواب دیا کہ بنت خارجہ کے پیٹ میں مجھے لڑکی دکھائی دے رہی ہے۔

اس واقعہ کو ابن سعدؓ نے اس طرح روایت کیا ہے کہ بنت خارجہ کے پیٹ کی لڑکی کو میرے دل میں القاء کیا گیا ہے۔ یعنی میری بیوی بنت خارجہ کے پیٹ میں لڑکی ہے۔ بالآخر جناب ام کلثوم پیدا ہوئیں۔

کرامت فاروق اعظم سیدنا عمر بن الخطابؓ

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ فاروق اعظمؓ نے جناب ساریہ کی قیادت میں جہاد کی غرض سے ایک لشکر روانہ فرمایا تھا۔ حضرت فاروق اعظمؓ ایک دن خطبہ پڑھ رہے تھے کہ اسی خطبہ کے دوران میں فرمانے لگے اب ساریہ! پہاڑ کی طرف ہٹ جا آپ نے تین دفعہ اسی طرح فرمایا کیونکہ پہاڑ کی طرف ہٹ جانے سے مسلمانوں کے غالب ہو جانے کی امید تھی جب تھوڑے دنوں بعد اس فوج کا قاصد آیا تو فاروق اعظمؓ نے اس سے لڑائی کا حال پوچھا۔ قاصد نے عرض کیا۔ اے امیر المومنین! ایک دن شکست کھانے ہی والے تھے کہ ہمیں ایک آواز سنائی دی جیسے کوئی پکار کر کہہ رہا ہے کہ اے ساریہ پہاڑ کی طرف ہٹ جا۔ اس آواز کو ہم نے تین مرتبہ سنا اور ہم نے پہاڑ کی طرف پیٹھ کر کے سہارا لیا ہی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان مشرکین کو شکست فاش دی۔

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ لوگوں نے فاروق اعظمؓ سے کہا۔ جبھی تو آپ جمعہ کے دن خطبہ کے درمیان بار بار پکار رہے تھے۔ یہ پہاڑ جہاں ساریہ اور ان کی فوج تھی مشرق کے شہر نہاوند میں تھا۔

کرامت حضرت سیدنا عثمان بن عفان ذوالنورینؓ

حضرت عثمان ذی النورینؓ کے آزاد کردہ غلام مجحن کہتے ہیں کہ ایک دن میں آپ کے ساتھ آپ کی ایک زمین پر گیا جہاں ایک عورت نے جو کسی تکلیف میں مبتلا تھی آپ کے پاس آ کر عرض کیا۔ اے امیر المومنین! مجھ سے زنا کا ارتکاب ہو گیا ہے۔ اس پر آپ نے مجھے حکم دیا کہ اس عورت کو نکال دو چنانچہ میں نے اس کو بھگا دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس عورت نے آ کر پھر اسی غلطی کا اعتراف کیا۔ چنانچہ سرکار کے فرمانے پر کہ اے مجحن اسے باہر نکال دو۔ میں نے دور بھگا دیا۔ اور تیسری مرتبہ اس عورت نے پھر آ کر کہا کہ اے خلیفہ وقت میں نے بلا شک وشبہ گناہ کبیرہ کیا ہے۔ میرے اوپر حد زنا جاری فرما دی جائے۔ اس پر میرے آقا حضرت عثمانؓ نے ارشاد فرمایا۔ اونا واقف مجحن! اس عورت پر مصیبت آپڑی ہے اور مصیبت و تکلیف ہمیشہ شر و فساد کا سبب ہوتی ہے۔ تم جاؤ اور اس کو اپنے ساتھ لے جا کر اس کو پیٹ بھر کر روٹی اور تن بھر کپڑا دو۔ اس دیوانی کو میں اپنے ساتھ لے گیا اور اس کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جو میرے آقا نے فرمایا تھا یعنی میں نے آرام سے رکھا۔ تھوڑے دنوں بعد جب اس کے ہوش و حواس ٹھکانے لگے اور وہ مطمئن ہو گئی۔ تب آپؓ نے فرمایا کہ اچھا اب کھجور، آٹا اور کشمش سے ایک گدھا بھر کر کل اس کو جنگل کے باشندوں کے پاس لے جاؤ اور ان بادیہ نشینوں سے کہو کہ اس عورت کو اس کنبہ والوں اور اہل و عیال کے پاس پہنچا دیں۔ چنانچہ میں کھجوروں، کشمش اور آٹے سے بھرے ہوئے گدھے کو لے کر اس کے ساتھ روانہ ہوا۔ میں نے رستہ میں چلتے چلتے کہا کہ اب بھی تم اس بات کا اقرار کرتی ہو جس کا تم نے امیر المومنین کے سامنے اقرار کیا تھا وہ کہنے لگی نہیں ہرگز نہیں۔ کیونکہ میں نے جو کچھ کہا تھا وہ صرف تکلیفوں اور مصیبتوں کے پہاڑ پھٹ پڑنے سے کہا تھا تاکہ حد لگا دی جائے اور مجھے مصیبتوں سے نجات مل جائے۔

کرامت سیدنا حضرت علی ابن ابی طالبؓ

حضرت ابو رافع روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے جب حضرت علیؓ کو جھنڈا دے کر خیبر کی طرف روانہ کیا تو ہم بھی ان کے ساتھ تھے جب ہم قلعہ خیبر کے پاس پہنچے جو مدینہ منورہ کے قریب ہے تو خیبر والے آپؓ پر ٹوٹ پڑے۔ آپؓ نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے تھے کہ آپؓ پر ایک یہودی نے وار کر کے آپؓ کے ہاتھ سے آپ کی ڈھال گرا دی۔ اس پر جناب حیدر کرارؓ نے قلعہ کے ایک دروازہ کو اکھیڑ کر اپنی ڈھال بنا لیا اور اس کو ڈھال کی حیثیت سے اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے شریک جنگ رہے۔ بالآخر دشمنوں پر فتح حاصل ہو جانے کے بعد اس ڈھال نما دروازہ کو اپنے ہاتھ سے پھینک دیا۔ اس سفر میں میرے ساتھ سات آدمی اور بھی

تھے اور ہم آٹھ آدمی مل کر اس دروازے کو الٹ دینے کی کوشش کرتے رہے۔لیکن وہ دروازہ جس کو تن تنہا حیدر کرارؓ نے اپنے ایک ہاتھ میں اٹھا لیا تھا اس کو ہم آٹھوں آدمی کوشش کے باوجود پلٹ تک نہ سکے۔

کرامت حضرت انسؓ

حضرت انس بن نضرؓ جو حضرت انس بن مالک کے بھتیجے تھے، روایت کرتے ہیں کہ ان کی پھوپھی نے کسی لڑکی کا اگلا دانت توڑ دیا تھا۔ ہمارے خاندان کے لوگوں نے لڑکی کے رشتہ داروں سے معافی مانگی تو انہوں نے انکار کر دیا۔ پھر ان سے کہا گیا کہ تم لوگ دیت یعنی دانت کے بدلے دانت لینے کے بجائے کچھ رقم لے لو اس پر بھی ان لوگوں نے انکار کیا۔ اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر معاف دینے اور دیت قبول کرنے پر انکار کرتے ہوئے قصاص طلب کیا۔ چنانچہ بحکم قرآن کریم سرورِ عالم ﷺ نے قصاص کا حکم صادر فرما دیا۔ اس پر حضرت انس بن نضرؓ نے کہا۔ یا رسول عالم ﷺ! کیا میری پھوپھی حضرت ربیع کا اگلا دانت توڑ دیا جائے گا۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے ان کا دانت توڑا نہیں جائے گا۔ اس پر سرورِ دو عالم ﷺ نے فرمایا۔ اے انس! اللہ کی کتاب تو قصاص کا حکم دیتی ہے اس پر ان لوگوں نے خوش ہو کر دانت کا بدلہ معاف کر دیا۔ سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا۔ بیشک بعض بندے ایسے ہیں کہ اگر اللہ کے بھروسہ پر قسم کھا لیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا فرماتا ہے۔

کرامت حضرت سعد بن ابی وقاصؓ

امام بخاریؒ ایک طویل قصے میں بیان کرتے ہیں کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے فرمایا۔ اللہ کی قسم میں اس شخص (ابو سعدہ) کے لئے بددعا کرتا ہوں، جس نے میری تین جھوٹی شکائتیں کی تھیں۔ اے اللہ! یہ تیرا جھوٹا بندہ جو مکاری سے شکائتیں سنانے کے لئے کھڑا ہوا ہے۔ اس کی عمر دراز کر دے اس کی محتاجی میں اضافہ کر دے اور اس کو فتنہ و فساد میں مبتلا کر دے۔ حضرت سعد کی اس دعا کے بعد لوگوں نے اسے دیکھا کہ جب اس سے خیریت دریافت کی جاتی تو وہ بوڑھا پھونس جواب دیا میں بالکل بڈھا ہو گیا ہوں، میری عقل ماری گئی ہے اور سعدؓ کی بددعا لگ گئی ہے۔ حضرت عبدالمالکؒ کہتے ہیں کہ میں نے اس بڈھے کو اس حال میں دیکھا کہ بڑھاپے کی وجہ سے اس کی آنکھوں کو اس کی دونوں بھنوؤں نے بالکل چھپا لیا تھا اور وہ رستہ چلتی لونڈیوں، باندیوں کو روکتا تھا اور اتنا بے حیا ہو گیا تھا کہ رستہ ہی میں چھیڑ چھاڑ کرتا تھا۔ افلاس و غربت کی وجہ سے انتہائی تنگدست تھا۔ الحاصل حضرت سعدؓ کی یہ تینوں باتیں درازی عمر، افلاس اور فتنہ میں مبتلا ہونا درگاہ خداوندی میں مقبول ہوئیں۔

کرامت حضرت حنظلہؓ

حضرت حنظلہؓ بن عامر نے جمیلہ دختر عبداللہ بن ابی سلولؓ سے شادی کی اور سرکار دو عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اجازت لے کر جنگ اُحد کی رات اپنی بیوی کے ساتھ رہے، غسل کی حاجت تھی اسی حالت میں صبح سویرے ہتھیار لگا کر مسلمانوں کی فوج میں پہنچ گئے۔ حضرت حنظلہؓ نے فوج میں آتے ہی دل کھول کر ہاتھ دکھائے جس کے نتیجہ میں مشرکین کو شکست نظر آ رہی تھی اور انہوں نے ابوسفیان کو جواب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے مارنا ہی چاہا تھا کہ پیچھے سے اسود بن شعیب نے حملہ کر کے حنظلہؓ کو ایسا برچھا مارا کہ وہ شہید ہو گئے۔ رسول اللہﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے فرشتوں کو دیکھا کہ وہ حنظلہؓ بن عامر کو چاندی کے ٹب میں بارش کے پانی سے خلاء میں نہلا رہے ہیں۔ ابو اسید ساعدیؓ نے کہا کہ ہم نے حنظلہؓ کو دیکھا کہ ان کے بالوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں اور یہ دیکھ میں فوراً سرور عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضری ہو کر تمام واقعہ سنایا۔ اس پر سرور عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کی بیوی کے پاس ایک قاصد بھیجا کہ حضرت حنظلہؓ کے بارے میں معلومات حاصل کرے چنانچہ اس قاصد سے جناب جمیلہ نے کہا کہ وہ جہاد کے میدان میں گھر سے جب گئے تو انہیں غسل کی ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعے حنظلہؓ کو غسل دلایا۔ حضرت حنظلہ شہیدؓ کے سر کے بالوں سے پانی کی بوندیں ٹپکتے ہوئے رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ اور لوگوں نے بھی دیکھیں۔

کرامت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بروایت امام بخاریؒ مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ہم کئی صحابی کھانا کھا رہے تھے۔ ہم نے سنا کہ وہ غذا اللہ تبارک وتعالیٰ کی تسبیح بیان کر رہی تھی یعنی وہ کھانا سبحان اللہ، سبحان اللہ پڑھ رہا تھا۔

کرامت حضرت اسید بن حضیر وعباد بن بشرؓ

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالمﷺ سے جنات اُسید وعباد نے اپنی کچھ ضرورتیں ظاہر کیں جس میں کچھ رات ہوگئی۔ رات بہت تاریک تھی چنانچہ وہ اسی اندھیرے میں اپنے گھروں کو لوٹے ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ ان میں سے ایک لاٹھی روشن ہوگئی اور لالٹین کا کام دینے لگی۔ جس کی روشنی کی مدد سے دونوں چلنے لگے۔ جب ایک کا راستہ ختم ہو گیا اور دوسرے کو آگے جانا تھا تو دوسرے کی لاٹھی بھی روشن ہوگئی اور دوسرا بھی اپنے گھر روانہ ہو گیا اور یہ دونوں اپنی اپنی لاٹھی کی روشنی میں اپنے اپنے گھر پہنچ گئے۔

کرامت والد حضرت جابرؓ

حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ جنگ اُحد کے وقت ایک رات مجھے میرے والد نے طلب کر کے فرمایا، کل اصحاب رسولﷺ کی شہادت میں سب سے اول میری شہادت واقع ہوگی۔ رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ تم مجھے سب سے زیادہ عزیز ہو۔ مجھ پر ایک آدمی کا قرضہ ہے وہ ادا کر دینا اور میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اپنی بہنوں کے ساتھ بھلائی کرنا، صبح کو میں نے دیکھا کہ سب سے پہلے میرے والد ہی نے جام شہادت نوش فرمایا۔

کرامت حضرت سفینہؓ

ابن منکدر سے روایت ہے کہ حضرت سفینہؓ جو رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے غلام تھے ایک مرتبہ سر زمین روم میں اپنے اسلامی لشکر کا راستہ بھول گئے۔ وہ راستہ تلاش کر رہے تھے کہ دشمنان اسلام نے انہیں گرفتار کر لیا۔ ایک دن قید سے بھاگ کر راستہ تلاش کر رہے تھے کہ ان کی ایک شیر سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ چنانچہ حضرت سفینہؓ نے اس شیر کو کنیت سے پکار کر کہا: اے ابوالحارث! سن میں رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا غلام ہوں اور میں راستہ بھول گیا ہوں۔ جنگل کا شیر یہ سن کر ان کے سامنے کھڑے ہو کر دم ہلانے لگا۔ اور پھر ان کے برابر چلنے لگا۔ اسے جب کوئی آواز سنائی دیتی تو وہ فوراً ادھر کا رخ کر لیتا اور پھر آپ کے ساتھ بغل میں چلنے لگتا۔ جب حضرت سفینہؓ اپنے اسلامی لشکر میں پہنچ گئے تو شیر واپس لوٹ گیا۔

کرامت حضرت ابوہریرہؓ

حضرت ابوہریرہؓ ایک طویل قصہ کے ماتحت کہتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجھ سے پوچھا۔ تمہارے قیدی کا کیا حال ہے؟ میں نے عرض کیا کہ حضور اس کا ارادہ ہے کہ مجھے ایسی باتیں سکھائے گا جن سے مجھے فائدے ہونگے۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ یاد رکھو جو کچھ اس نے کہا وہ ٹھیک ہے لیکن تین راتوں سے تم جس سے باتیں کر رہے ہو جانتے ہو وہ کون ہے؟ میں نے عرض کیا۔ حضورﷺ میں اس حقیقت کو نہیں جانتا۔ رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا وہ مردود شیطان ہے۔

کرامت حضرت ربیعؒ

حضرت ربعیؒ بن حراش کہتے ہیں کہ ہم چار بھائی تھےاور ہمارے بڑے بھائی حضرت ربیعؒ پکے نمازی اور بڑے روزے دار تھے۔سردیوں گرمیوں میں بھی وہ نفلیں پڑھتے اور روزے رکھتے تھے۔جب ان کا انتقال ہوا تو ہم سب ان کے پاس اکٹھے تھے اور ہم ان کے لئے کفن کا کپڑا لینے بھیج چکے تھے کہ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے منہ سے کپڑا ہٹا کر کہا کہ السلام علیکم اے برادران عبس۔لوگوں نے جواب دیا، وعلیکم السلام۔اور کہا: کیا موت کے بعد بھی تم بات چیت کرتے ہو؟ حضرت ربیعؒ نے جواب دیا۔ ہاں،تم سے جدا ہو کر جب پروردگار عالم سے ملا تو میں نے اسے غضبناک نہیں دیکھا اس نے مجھ پر رحمتوں کے بادل برسا کر جنت کی خوشبوئیں، جنت کی روزی، جنت کے لباس، دبیز ریشمی کپڑے مرحمت فرمائے۔سنو حضرت ابوالقاسم! رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام میری نماز پڑھانے کے منتظر ہیں بس اب دیر مت لگاؤ اور جلدی کرو۔اس کے بعد وہ اس طرح ہو گئے جیسے کسی طشت میں ایک کنکری گر جائے۔پھر ان کے کفن دفن کا انتظام کیا گیا۔

یہ قصہ جب حضرت عائشہؓ صدیقہ کو سنا ئی گیا تو آپؓ نے فرمایا۔مجھے یاد ہے، ایک دفعہ رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا تھا کہ میری امت میں ایسے آدمی ہیں جو مرنے کے بعد بھی گفتگو کرتے ہیں۔

کرامت حضرت علاء بن حضرمیؓ

سہم بن منجاب نے بیان کیا ہے کہ ہم علاء بن حضرمیؓ کے ساتھ جہاد کیلئے روانہ ہو کر مقام دارین پہنچے۔ہندوستانی مشک اور کستوری کی بحرین میں بہت بڑی منڈی ہے اور سمندر کے ساحل پر واقع ہے چنانچہ حضرت علاء بن حضرمیؓ نے سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر کہا:

''اے اللہ! تو جاننے والا تو قوت والا ہے تو بہت بڑا ہے۔ہم تیرے معمولی بندے یہاں کھڑے ہوتے ہیں اور اسلام کا دشمن سمندر کے اس سرے پر ہے۔اللہ ان کو شکست دینے کے لئے ان کو راہ راست پر لانے کے لئے اور ان کو اسلام کا کلمہ پڑھانے کے لئے ہم کو ان تک پہنچا دے۔''

اس دعا کے بعد انہوں نے ہم کو سمندر میں اتار دیا۔سمندر کا پانی ہمارے گھوڑوں کے سینوں تک بھی نہیں پہنچا اور ہم نے سمندر پار ہو کر اسلام کے دشمنوں سے جہاد کیا۔

کرامت حضرت اسامہ بن زیدؓ

حضرت اسامہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حضور حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا۔

کرامت حضرت بلال بن حارثؓ

حضرت بلال بن حارثؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ہم لوگ رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے شریک سفر تھے۔ مکہ معظمہ کے راستے میں بمقام ''عروج'' پڑاوڈالا اور الگ الگ خیمے نصب کئے گئے۔

میں اپنے لشکر سے نکل کر سرکار دو عالم ﷺ سے ملاقات و مزاج پرسی کے لئے جب لشکر کے خیمہ میں پہنچا تو آپ ﷺ وہاں سے دور سامنے جنگل میں تنہا تشریف فرما تھے۔ میں لپکتا ہوا جب قریب پہنچا تو شور و غوغا کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ بس میں سمجھ گیا کہ مردان غیب کا ہجوم ہے اور اس میں وہیں دور ٹھہر گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ بہت سے آدمی اونچی آواز میں باتیں کر رہے ہیں اور جھگڑا ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام مسکراتے ہوئے میرے پاس تشریف لائے۔ میں نے وہیں جنگل میں عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ یہ کیسا شور تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مسلمان جنوں اور کافر جنوں میں رہائش کے لئے نزاع تھا۔ میں نے ان لوگوں کا مقدمہ سن کر یہ فیصلہ کر دیا کہ مسلمان جن ''حبش'' میں اور کافر جن ''غور'' میں سکونت اختیار کریں اور آپس میں ہرگز نہ ملیں۔ اس پر وہ راضی ہو گئے اور چلے گئے۔

کرامت حضرت سلمانؓ وابو درداءؓ

حضرت سلمانؓ اور حضرت ابودرداءؓ بیٹھے ہوئے تھے اور دونوں کے سامنے ایک پیالہ رکھا ہوا تھا جو ''سبحان اللہ'' پڑھ رہا تھا۔

کرامت ام المومنین حضرت عائشہؓ

ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں سخت قحط پڑا۔ ان قحط زدہ لوگوں نے حضرت عائشہ صدیقہ سے جا کر کہا کہ اس قحط سے ہم لوگ بہت پریشان ہو گئے ہیں۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مزار مبارک کی طرف اور گنبد خضرا میں آسمان کی طرف کو ایک آر پار سوراخ کر دو تا کہ دونوں کے بیچ میں کوئی چیز حائل نہ رہے۔ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا خوب بارش ہوئی۔

حضرت عائشہ صدیقہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک دن فرمایا:

''اے عائشہؓ! یہ جبریلؑ تم کو سلام کر رہے ہیں''۔ میں نے جواباً کہا ان پر اللہ کی سلامتی، رحمتیں اور برکتیں ہوں۔

کرامت حضرت خدیجہ الکبریٰؓ

ایک بار حضرت سرور عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جبریئل نے مجھ سے آکر کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! آپ کے پاس بی بی خدیجہؓ آرہی ہیں اور ان کے ہاتھ میں جو برتن ہے اس میں سالن کھانے کی چیز اور پینے کی چیز ہے۔ جب وہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس آجائیں تو ان سے میرا سلام کہہ دیجئے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو سلام کہا ہے۔ اور یہ کہہ دیجئے کہ آپ خوش ہو جائیے آپ کے لئے جنت میں ایسا مکان ہے جو موتیوں کا بنا ہوا ہے۔ جہاں کوئی شور وغل نہیں ہے اور کوئی تکلیف نہیں ہے۔

کرامت حضرت بی بی فاطمۃ الزہراؓ

حضرام سلمیٰؓ نے بیان کیا ہے کہ حضرت فاطمہؓ بیمار تھیں اور میں تیمار دار تھی۔ ایک دن صبح سویرے انہیں افاقہ محسوس ہوا۔ حضرت علیؓ کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ حضرت فاطمہؓ نے کہا۔ اے اماں! میں نہانا چاہتی ہوں۔ میں نے پانی تیار کر دیا اور جس طرح وہ تندرستی میں نہاتی تھیں ویسے ہی خوب نہائیں پھر انہوں نے نئے کپڑے مانگے۔ میں نے ان کو کپڑے بھی دے دیئے۔ انہوں نے خود پہن کر کہا: امی اب ذرا آپ میرے لئے گھر کے بیچوں بیچ بچھونا بچھا دیجئے۔ میں نے یہ بھی کر دیا۔ بس وہ بستر پر جا کر لیٹیں اور قبلہ کی طرف منہ کر کے اپنا ایک ہاتھ اپنے گال کے نیچے رکھ کر کہا۔ اے امی جان! اب میں اللہ تعالیٰ سے ملنے جا رہی ہوں اور بالکل پاک ہوں۔ اب کوئی بلا ضرورت مجھے کھولے نہیں۔ اس کے بعد ان کی روح پرواز کر گئی۔ حضرت علیؓ کے آنے کے بعد پورا واقعہ میں نے ان کے گوش گزار کیا۔

مندرجہ بالا واقعات و کرامات بہت ہی اختصار کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ ورنہ ہر صحابی کی زندگی میں بے شمار خرق عادت موجود ہیں بلکہ بعض صحابہ کرام کی پوری زندگی کرامت اور خرق عادت تھی۔

حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے ارشاد کے مطابق صحابہ کرامؓ کو ان طرزوں کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ صحابہ کرام حقیقت میں عشق الٰہی اور عشق رسول ﷺ میں اس قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ انہیں خرق عادات یا کرامات کو جمع کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔

روحانیت اور تصوف کے بارے میں یہ کہنا کہ جب صحابہ کرامؓ سے کرامات ظاہر نہیں ہوئیں تو اولیاء اللہ سے کس طرح کرامات ظاہر ہو سکتی ہیں؟ محض غلط فہمی ہے۔ سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابی اور صحابیات کی کرامات اور خرق عادات کا اسلامی تاریخ میں ریکارڈ موجود ہے۔ مراقبہ دراصل ذہنی یکسوئی کے ساتھ اپنی روحانی صلاحیتوں اور غیب بین نظر کو بیدار اور متحرک کرنے کے لئے ایک طریقہ اور ایک راستہ ہے۔

مراقبہ سے مراد مرتبہ احسان ہے۔مراقبہ کے ذریعہ جب آدمی کے اندر روحانی آنکھ کھل جاتی ہے تو اسے مرتبہ احسان حاصل ہو جاتا ہے۔مرتبہ احسان یہ ہے کہ بندہ یہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے کہ اسے اللہ دیکھ رہا ہے اور مرتبہ احسان یہ ہے کہ بندہ یہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں۔

یاد رکھیئے! نور نبوت کے ذریعہ صحابہ کرام اور صحابیات ؓ کا مرتبہ احسان حاصل تھا اور مرتبہ احسان کا حاصل ہونا بلاشبہ روحانیت ہے۔مرتبہ احسان میں آدمی کے اندر روحانی صلاحیتیں متحرک اور روح کی آنکھ بیدار ہو جاتی ہے۔

ایٹم بم

جب کوئی بندہ کسی ایک نقطہ پر اپنی پوری صلاحیتیں مرکوز کر کے غور کرتا ہے تو اس کی نظر میں اتنی وسعت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اس نقطہ کو جس کے اوپر تمام صلاحیتیں مرکوز ہو گئی ہیں، پڑھ لیتا ہے۔ پڑھنے سے منشاء یہ ہے کہ نقطہ کے اندر موجود اوصاف اور نقطہ کے اندر موجود خفیہ صلاحیتیں اور صلاحیتوں کے اندر مخفی صلاحیتیں اس کے سامنے آجاتی ہیں۔ جب اور زیادہ گہرائی میں دیکھتا ہے تو نقطہ اس کو اپنا استعمال بتا دیتا ہے۔ نقطہ کے اندر موجود مخفی قوتیں اس بات کا مشاہدہ بن جاتی ہیں کہ پوری پوری کہکشائیں ہمارے ساتھ سفر کر رہی ہیں۔ ہم جان لیتے ہیں کہ دنیا میں موجود ہر شئے لہروں پر قائم ہے۔ ہم اور پوری کائنات لہروں کے تانے بانے سے مرکب ہے۔ دنیا کی ہر چیز چاہے وہ پانی ہو، درخت ہو، پتھر ہو، انسان ہو، چرند ہو، پرند ہو، انرجی ہو، آکسیجن ہو یا ایٹم بم یا مالیکیول ہو روشنیوں کے ہالے میں بند ہے یعنی ہر چیز کے اوپر روشنی کا ایک غلاف ہے۔ نظر کے سامنے پہلا انکشاف طاقت کا ہوتا ہے۔ نظر میں جب مزید گہرائی پیدا ہوتی ہے تو دوسرا انکشاف اس طاقت کے استعمال کا ہوتا ہے۔ مزید گہرائی واقع ہو جانے سے تیسرا انکشاف یہ ہوتا ہے کہ طاقت مظہر بن کر سامنے آجاتی ہے۔

ہیروشیما اور ناگاساکی کے اوپر ایٹم بم گرایا گیا تو ایٹم کی طاقت کا مظاہرہ اس شکل میں ہوا کہ جن پہاڑیوں پر بم گرایا گیا تھا وہ پہاڑیاں دھواں بن گئیں۔ لوگوں نے دیکھا کہ پہاڑ کھڑے ہیں جب پہاڑ کو چھوا گیا تو دھوئیں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ سوال یہ ہے کہ طاقت کا کھوج کس نے لگایا۔ طاقت کا استعمال کس نے کیا اور طاقت کے مظاہرہ سے کون متاثر ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایٹم کی طاقت کا کھوج انسانوں سے لگایا اس کی طاقت کو استعمال انسانوں نے کیا اور اس طاقت کے تخریبی اور تعمیری پہلو سے بھی انسان ہی متاثر ہوا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ ایٹم کے اندر موجود طاقت اللہ کریم کی تخلیق ہے اور اس طاقت کو استعمال کرنے کا طریقہ اللہ نے انسان کو سکھا دیا۔ لاشعور بتاتا ہے کہ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے اتنی سکت اور صلاحیت منتقل کر دی ہے کہ وہ ایٹم کی طاقت کو اپنے ارادے اور اپنی منشاء کے مطابق استعمال کر سکتا ہے۔ یہ کہنا ہرگز بے جا نہ ہوگا کہ خالق ہر حال میں تخلیق سے زیادہ با صلاحیت، باوصف اور باہمت ہے۔ ایٹم کی طاقت کے خالق کی حیثیت سے جب ہم انسانی کردار پر نظر ڈالتے ہیں تو دراصل ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسی مخفی صلاحیتیں اور قوتیں عطا کر دی ہیں جس کے سامنے ایٹم بم کی قوت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ فرق صرف ایٹم کے استعمال کا

ہے۔ہم ایٹم کے اندران لہروں کوتلاش کرتے ہیں جوتباہی وبربادی کا پیش خیمہ ہیں یا ان صلاحیتوں کوتلاش کرتے ہیں جونوع انسانی کی تعمیر میں کام آتی ہیں۔

جب ہر چیز لہروں پر قائم ہےتو انسانی وجود بھی لہروں سے بنا ہوا ہے۔لہروں میں قائم وجود میں تفکر انسان کے اوپر منکشف کردیتا ہے کہ انسان میں تخلیقی صلاحیت موجود ہے۔جس طرح ایٹم ایک نقطہ ہےاور اس نقطہ کے اندر ایسی طاقت محفوظ ہے کہ اگر انہیں تخریبی ذہن سے استعمال کیا جائے تو زمین الٹ پلٹ جاتی ہے۔ پورے پورے شہر آناً فاناً تباہ وبرباد ہو جاتے ہیں۔اس ہی ایٹم کو اگر تعمیر میں استعمال کیا جائے تو بجلی ایجاد ہو جاتی ہے۔وہ بجلی جو ہر سائنسی ترقی میں کسی نہ کسی طرح موجود ہے۔

انسان کے اندر بھی ایک ایٹم ہےاس ایٹم یا نقطہ کے اندر بھی بے شمار طاقتیں ذخیرہ ہیں۔جب یہ ایٹم کھلتا ہےتو آدمی مادی وسائل سے بے نیاز ہو کر روحانی طور پر ان فارمولوں کا مشاہدہ کر لیتا ہےجن فارمولوں سے سورج بنتے ہیں، چاند وجود میں آتے ہیں۔جن فارمولوں سے ستارے قائم ہیں، جن فارمولوں پر آسمان قائم ہیں، جن فارمولوں اور کلیوں کے اوپر زمین گردش کر رہی ہے۔

مثال:

ہم شربت بناتے ہیں ہمیں یہ معلوم ہے کہ پانی میں چینی گھول دی جائے تو شربت بن جاتا ہےاور اس شربت میں خوشبو ملا دی جائے تو شربت خوشبودار اور مفرح ہو جاتا ہے۔اسی شربت میں رنگ کی آمیزش کردی جائے تو شربت خوش شکل ہو جاتا ہے۔اسی شربت میں کوئی ایسی ٹھنڈی دوا شامل کردی جائے جو خون کو ٹھنڈا کر دے تو یہ شربت گرمی سے پیدا ہونے والے امراض کا علاج بن جاتا ہے۔

روٹی پکانا ایک فارمولے کے اوپر قائم ہے۔جب ہم روٹی کا تذکرہ کرتے ہیں تو روٹی سے متعلق جتنے اعمال ہیں وہ خود بخود زیر بحث آجاتے ہیں۔روٹی کا مطلب ہے زمین کے اندر گیہوں ڈالنا، زمین کی کوکھ میں دور کرنے والے روشنیوں اور لہروں کا گیہوں کے بیج پر اثر انداز ہونا، گیہوں کے بیج کے اندر موجود روشنیوں اور لہروں کا گیہوں کے بیج پر اثر انداز ہونا، گیہوں کے بیج کے اندر موجود روشنیوں اور لہروں کا زمین کی لہروں اور روشنیوں سے باہم مل کر ایک دوسرے کا تاثر قبول کرنا، ایک دوسرے کے اندر لہروں کا جذب ہونے کے بعد گیہوں کے بیج میں کلہ پھوٹنا، بیج کا پیدائش کے بعد زمین کی کوکھ سے باہر آنا، سورج کی تپش سے پکنا، چاند کی چاندنی سے گیہوں کے اندر مٹھاس پیدا ہونا، گیہوں کے بیج کا جوان ہونا اور پھر اس کو چکی میں پیسنا، آٹا بننا، آٹے اور پانی کے ملاپ سے ایک نئی شکل اختیار کرنا، آٹے اور پانی کے ملاپ سے جو مرکب بنا ہے اس مرکب کا آگ پر پکنا ان تمام عوامل سے گزر کر روٹی پکتی ہے۔ایک عام آدمی کہتا ہے روٹی کھاؤ بات ختم ہوگئی لیکن تفکر

کرنے والا بندہ یہ تلاش کرتا ہے کہ روئی کیا ہے اور کیسے وجود میں آئی۔ اس ہی طرح انسان بھی ایک نقطہ ہے۔
نقطہ کو توڑا جائے بالکل اس طرح جس طرح ایٹم کو توڑ دیا گیا ہے تو اس کے اندر عجائبات نظر آتے ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے کائنات کہا ہے۔ انسان کی پوری نسل، انسان کی پوری نوع، جنات اور جنات کی پوری نوع، فرشتے، آسمان، جنت، دوزخ، عرش اور انتہا یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ اس نقطہ کے اندر موجود ہے۔ جب یہ نقطہ کھلتا ہے تو انسان مشاہداتی طرزوں میں قدم قدم سفر کرکے منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے اور مقصود اور منظور و مطلوب اللہ تعالیٰ ہے۔ تصوف میں اس نقطہ کا نام ''فواد'' ہے جس کا ترجمہ دل ہے۔ یہ وہی دل ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنا مسکن اور اپنا گھر قرار دیا ہے۔ یہ وہی دل ہے جو کبھی غلط بیانی نہیں کرتا، کبھی جھوٹ نہیں بولتا، جو کچھ دیکھتا ہے حقیقت دیکھتا ہے۔ دل خالق کائنات کو دیکھتا ہے، خالق کائنات دل کو دیکھتا ہے۔

نوکروڑمیل

کائنات کے وجود کے بارے میں اور کائناتی وجود کی تاویلات وتشریحات میں انسانی ذہن صدیوں سے سرگرداں ہے۔ ہر انسان جس میں تھوڑی سی بھی علمی شدبد ہے وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ..........

کائنات کیا ہے؟

کیوں ہے؟

اور کہاں ہے؟

کائنات کیا ہے، کیوں ہے اور کہاں ہے؟ میں انسان کی اپنی ذات کی تفہیم بھی آجاتی ہے۔ جو انسان کائنات کے بارے میں سمجھنا چاہتا ہے وہ اپنے بارے میں بھی یہ سوچتا ہے..........

میں کیا ہوں؟

کیوں ہوں؟

کہاں ہوں؟

انسانی وجود دنیا میں پیدائش سے پہلے کہاں تھا؟ انسانی وجود اس دنیا سے گزرنے کے بعد جہاں چلا جاتا ہے وہاں جزا اور سزا کا قانون کس طرح نافذ العمل ہے۔

یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب انسان خود پیدائش پر اختیار نہیں رکھتا، موت پر اسے کسی قسم کی دسترس حاصل نہیں تو اعمال کی سزا اور جزا میں کون سا قانون کام کرتا ہے۔

دنیا میں آنے کے بعد کوئی بھی انسان شعور کے دائرے میں داخل ہوتے ہی چاند، سورج اور ستاروں میں دلچسپی لینا شروع کر دیتا ہے۔ قدیم قصے کہانیوں اور لوک داستانوں میں اجرام فلکی وسماوی کے تذکرے ملتے ہیں۔ مسلسل تذکروں اور تلاش نے انسان کے اندر جذبہ ابھارا کہ وہ تلاش کرے کہ چاند اور سورج کیا ہیں..........کیا انسان چاند اور سورج کے رشتے کو استوار کر سکتا ہے؟..........کیا کسی طرح سورج اور چاند میں یا فلکی نظام میں موت کے بغیر انسان کا داخلہ ممکن ہے؟

اس جذبہ تلاش اور شوق تجسس نے انسان کو اس طرح مائل کر دیا کہ چاند کی سیر کی جائے۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ انسان نے سورج اور کہکشانی نظاموں کے بجائے فلکی نظاموں یا غیب کی دنیا میں داخل ہونے کے بجائے چاند کا انتخاب کیوں کیا؟..........ہوسکتا ہے کہ چاند کا انتخاب اس لئے کیا گیا ہو کہ چاند زمین سے سورج کے مقابلے میں کم فاصلے پر واقع ہے۔ سورج کا فاصلہ نوکروڑمیل بتایا جاتا ہے جب کہ چاند کا فاصلہ

ڈھائی لاکھ میل متعین کیا گیا ہے۔

نو کروڑ میل کا فاصلہ اور چاند کا ڈھائی لاکھ میل کا فاصلہ کس اصول پر کون سے حساب یا کس جدول سے متعین کیا گیا ہے۔اس کے بارے میں انسانی تاریخ گونگی، بہری ہے۔ بہر حال انسان نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ بیسویں صدی میں وقت اور فاصلوں کی نفی کر کے انسان چاند پر پہنچ گیا۔جس کو تسخیر کائنات کی معراج سمجھا جاتا ہے۔مگر یہ المیہ ہر ذی شعور آدمی کے سامنے ہے کہ چاند پر پہنچنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ تسخیر کائنات کی کھوج کا سفر گرد آلود ہو گیا ہے۔اگرچہ تسخیر کائنات کے مضمون پر ضخیم کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں۔

کائنات کیا ہے؟------------

ہر وہ چیز جو اللہ تعالٰی نے تخلیق کی ہے اور انسان کو حواس خمسہ کے ذریعہ جن چیزوں کا ادراک ہوتا ہے، کائنات کہلاتی ہے۔لیکن ہمارا مشاہدہ ہے کہ حواس خمسہ محدود دائرے میں کام کرتے ہیں۔کائنات کا بہت بڑا حصہ تین چوتھائی سے بھی زیادہ بڑا حصہ ایسا ہے جہاں حواس خمسہ کام نہیں کرتے۔نہ صرف یہ کہ حواس خمسہ ناکام ہیں بلکہ وہم و خیال میں بھی کائنات کا حقیقی تصور قائم نہیں ہوتا اور اس طرح انسان مفروضات اور تاریک راہوں میں بھٹکنا شروع کر دیتا ہے۔فی الواقع کائنات کا علم اتنا وسیع ہے کہ انسان کے اندر کام کرنے والے حواس خمسہ کی کسی بھی طرح پہنچ ممکن نہیں۔

صاحبان بصیرت اور اپنے اندر ملکوتی صفات کے عارف بندے جب کائنات کی تخلیق پر تفکر کرتے ہیں تو وہ ایک ہی بات کا اعلان کرتے ہیں کہ کائنات کی بے پناہ وسعتوں کا احاطہ زمینی شعور سے ممکن نہیں ہے کیونکہ شعور (حواس خمسہ) محدود ہے۔اور کائنات لامحدودیت کی ایسی اکائی ہے جس میں داخل ہوئے بغیر کوئی انسان کائنات کا مشاہدہ نہیں کر سکتا۔

آج کا سائنس دان بلاشبہ قابل ستائش ہے کہ اس نے تسخیر کائنات میں ریسرچ کر کے انسانی شرف کو اجاگر کیا ہے لیکن یہ بات ریکارڈ پر رہنی چاہئے کہ بڑے سے بڑا سائنس دان بڑے سے بڑا مفکر چاہے وہ کتنے ہی اعلیٰ نظریات کا بانی ہو محدود شعور میں رہتے ہوئے لامحدود کائنات کو نہیں سمجھ سکتا۔

نظریات بنتے رہتے ہیں اور مزید نظریات قائم ہوتے رہیں گے لیکن جب تک محدود عقل و شعور ان کا ساتھ دیتے رہے یہ نظریات قائم رہے اور جب محدود عقل و شعور نے ان نظریات کا ساتھ چھوڑ دیا تو یہ نظریات خود بخود ختم ہو گئے۔

قرآنی طرز فکر اور اسلوب بیان میں کائنات کی تخلیق پر اور کائنات کے اندر ہماری زمین کی طرح

اربوں کھربوں زمینوں کا مشاہدہ کرنے کے لئے جولوگ غور وفکر کرتے ہیں قرآن انہیں ''اولی الالباب'' کہتا ہے۔

''بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور دن رات کے ردو بدل میں اولی الالباب کے لئے نشانیاں ہیں۔'' (آل عمران۔۱۹۰)

اولی الالباب کون لوگ ہیں؟............

قرآن کے مطابق اولی الالباب وہ لوگ ہیں جو اٹھتے بیٹھتے کروٹ پر لیٹے اللہ کو یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

''اے ہمارے رب! آپ نے اس کو بیکار پیدا نہیں کیا۔آپ کی ذات پاک ہے۔آپ ہم کو نار کے عذاب سے بچالیجئے۔'' (آل عمران۔۱۹۱)

اولی الالباب کا مطلب ہے ایسا سمجھدار انسان جو آسمان اور زمین کی تخلیق کائناتی نظام وسائل کی پیدائش انسانی زندگی میں کام آنے والی انرجی اور توانائی پر غور وفکر کرتا ہے۔اولی الالباب جب تخلیق کے چھوٹے چھوٹے ادوار (بچپن،لڑکپن، جوانی، بڑھاپے اور موت) پر تفکر کرتا ہے تو اس کے اندر یقین کا پیٹرن بن جاتا ہے کہ کائنات کو بنانے والی کوئی ہستی ہے اور یہی ہستی کائنات پر حاکم و مالک اور قادر ہے۔ان کی طرز فکر میں خالق کائنات کی ہستی اس طرح جذب ہو جاتی ہے کہ وہ جان لیتے ہیں کہ ہم اس لئے زندہ ہیں کہ ہمارے خالق نے ہمیں (Protection) دیا ہوا ہے۔وہ یہ بھی دیکھ لیتے ہیں کہ اللہ ان کے اندر موجود ہے۔ انہیں یہ بھی علم ہو جاتا ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ نور کے غلاف میں بند ہے۔ایسا نور جو حواس خمسہ سے نظر نہیں آتا۔ایسی روشنی جو حواس خمسہ کے ادراک سے ماوراء ہے۔

اس تمہید کا مفہوم یہ ہوا کہ کائنات کا کھوج لگانے والے دو گروہ ہیں۔

ایک گروہ محدود حواس خمسہ میں کائنات کو تلاش کرتا ہے۔کائنات کے اربوں کھربوں اسرار میں سے چند اسرار پر سے تو پردہ اٹھ سکتا ہے لیکن محدود اور مفروضہ حواس سے کوئی آدمی وسیع وعریض کائنات کو نہیں دیکھ سکتا اور نہ کائناتی وسعتوں میں داخل ہوسکتا ہے۔

اس کے برعکس اولی الالباب (وہ لوگ جو مفروضہ حواس سے نکل کر لامحدود حواس میں داخل ہو جاتے ہیں) جب تفکر کرتے ہیں تو لامحدود کائنات ان کے سامنے آجاتی ہے۔آج کی سائنس انسانی شعوری ارتقا کی معراج سمجھی جاتی ہے۔کہا جاتا ہے کہ سائنس نے انسان کے شرف کی تکمیل کر دی ہے۔

یہ کیسی تکمیل ہے؟............ کہ

ہرانسان پریشان ہے آسائش و آرام کے لئے جتنی چیزیں بھی ایجاد ہو رہی ہیں یا ہو چکی ہیں انہوں نے زندگی کو عذاب بنا دیا ہے۔ ہر گھر بے سکونی اور پریشانی کا نارچ سیل بن گیا ہے۔ یہ عجیب منطق ہے کہ آرام و آسائش کا ہر سامان مہیا ہونے کے باوجود آدمی پریشان ہے۔ ہمارے جیسے جیسے سائنسی ایجادات اور مادی ترقی معرض وجود میں آرہی ہے اسی مناسبت سے بیماریاں بھی ترقی پذیر ہیں۔ بے سکونی اور پریشانی کے عفریت نے آدمی کو ڈس لیا ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ سائنسی ایجادات نوع انسانی کے لئے فائدہ مند نہیں ہیں یا سائنسی ایجادات میں مزید وسعت نہیں ہونی چاہئے۔ ہم ان حقائق پر سے پردہ اٹھانا چاہتے ہیں جو اس ترقی کے پیچھے نوع انسان کی ہلاکت کا سبب بن رہی ہے اور ہلاکت یہ ہے کہ سائنسی ایجادات کا محور مادیت ہے۔

اگر سائنسٹسٹ کائنات کی تخلیق پر تفکر کر کے ایجادات کا رخ خالق کائنات کی طرف پھیر دے تو یہ دنیا خوشحال دنیا بن جائے گی۔ چھوٹے سے چھوٹی عقل والا آدمی اور بڑے سے بڑا دانشور اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ سائنسی ایجادات قدرت کے پیدا کردہ وسائل کے تابع ہیں اور جتنے بھی زمین پر وسائل موجود ہیں ان میں جڑی بوٹیاں ہوں، جڑی بوٹیوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے مشینیں مشینوں کے لئے میٹریل ہوا پانی گیس روشنی ہو۔قدرت نے ہر چیز ہر شخص کے لئے مفت فراہم کی ہے۔

انسانی ذہن مفروضہ حواس سے نکل کر اگر اولی الالباب کے زمرے میں داخل ہو جائے تو انسان حقیقت آشنا ہو جائے گا اور جب حقیقت آشنا ہو جائے گا تو یہ زمین جنت ارضی بن جائے گی۔

کائنات کی تخلیق ہرگز عظیم حادثہ نہیں ہے۔

کائنات سوچے سمجھے منصوبے اور بہترین پروگرام کے ساتھ تخلیق کی گئی ہے۔ کائنات عظیم تر ذات اللہ کے حکم سے بنی ہے اور قادر مطلق اللہ کے حکم سے قائم ہے۔

سورہ حشر کی آیت میں ارشاد ہے:

''اللہ ہی پیدا کرنے والا ہے، ٹھیک ٹھاک بنانے والا ہے۔صورت بنانے والا۔ اس کے اچھے اچھے نام ہیں۔سب چیزیں اس کی تسبیح کرتی ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ اور اللہ ہی زبردست حکمت والا ہے۔''

زمین ناراض ہے

زمین ایک ہے۔ آسمان سات اور دن چھ ہیں جب کہ شعوری حواس بتاتے ہیں کہ دن چھ نہیں سات ہیں۔ جمعرات بدھ، منگل، پیر، اتوار، سنیچر اور جمعہ۔

دن چھ ہیں یا آسمان سات ان کا تذکرہ اسی وقت ہوتا ہے جب بندہ بشر زمین پر زندہ ہو۔ بشر کی زندگی اس وقت قابل بیان ہے جب وہ زمین پر پیدا ہو۔ زمین پر پیدائش اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ماں نہ ہو......

اور ماں کا وجود اپنی ماں کے وجود کے تابع ہے۔ ماں کی ماں یعنی نانی دادی کا وجود ماں کے پیٹ پر منحصر ہے کوئی بھی ہو ہر فرد ماں کا پیٹ ہے۔ نشوونما دینے نسل چلانے نسل کے لئے وسائل فراہم کرنے اور وطن مادر کو تخلیقی صلاحیتوں سے آراستہ کرنے والی ایجنسی زمین ہے۔

زمین مٹی ہے..............

زمین مٹی ہے تو زمین میں سے پیدا ہونے والی ہر شئے مٹی ہے۔ مٹی نہ ہوتی تو زمین پر لہلہاتے کھیت ہرگز نہ ہوتے۔ مٹی نہ ہوتی تو پھول نہ ہوتے۔ پھولوں میں رنگ نہ ہوتے۔ رنگوں میں اگر شوخی نہ ہوتی تو کشش نہ ہوتی۔ کشش نہ ہوتی، خزاں اور بہار کا تصور ختم ہو جاتا۔ خزاں اور بہار کا عمل نہ ہوتا، عاشق و معشوق کی وارفتگی عدم کا فسانہ بن جاتی۔ کہکشانی چمک زمین پر نہ اترتی تو اندھیری رات میں لاکھوں جگنو چراغ نہ جلتے بجھتے۔ چڑیوں کی چہک نہ ہوتی تو فضا میں سناٹے کے علاوہ کچھ نہ ملتا۔ پپیہے کی آواز کانوں میں رس نہ گھولتی تو دل کی دنیا بے قراری کے عمیق سمندر میں ڈوب جاتی۔ بانسری فراق کے گیت نہ گاتی تو آنسو خشک ہو جاتے۔ ہریالی نہ ہوتی تو دنیا ویرانہ بن جاتی۔ القصہ مختصر۔

شجر حجر آبشاریں، ندی، نالے، دریا، سمندر، چرند پرند، حشرات الارض سب زمین کی وجہ سے ہیں۔ جمادات میں لوہا سیسہ تانبا پیتل سونا چاندی کیا ہیں۔

زمین کی طبقاتی تقسیم میں جس طرح زمین میں سے نکلے ہوئے لوہے کے ڈھیلوں کو بھٹی میں پگھلا کر لوہا اور فولاد بنا لیا جاتا ہے اسی طرح تانبا، پیتل اور رالمونیم کو پگھلا کر برتن بنا لئے جاتے ہیں۔ چاندی اور سونا بھی جمادات سے متعلق ہیں۔ سونے کی ریت کو یا سونے کے ذرات کو بھٹی میں پگھلا کر سونے میں ڈھال لیا جاتا ہے۔ اس دھات کی انسانی معاشرے میں زیادہ قدر و قیمت ہے حالانکہ سونا نہ کھلایا جا سکتا ہے اور نہ سونے سے پیاس بجھتی ہے۔

اے انسان!

ذرا سوچ تو، کہاں جا رہا ہے، کیا کر رہا ہے؟ کبھی تم نے سوچا ہے کہ زمین کے ذرات ہر قدم پر تیرے محکوم ہیں۔ تیرے پیدا ہونے سے پہلے ہر چیز اس میں سونا چاندی بھی شامل ہے پہلے سے موجود تھی۔ تو جو یہاں ایک محدود وقت کے لئے مسافر ہے............

تو نے اپنی ذات سے زیادہ مٹی کے ذرات کو اہمیت دی۔

اے انسان!

زمین تجھ سے ناراض ہے کہ تو زمین پر چلتا پھرتا ہے۔ زمین میں سے کھاتا پیتا ہے۔ زمین پر سوتا جاگتا ہے اور تو نے صرف زمین کے سنہرے ذرات کو سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ تو ان ذرات کے پیچھے اس طرح دیوانہ بن گیا ہے کہ تجھے اپنا ہوش بھی نہیں رہا............

اور جب تجھے اپنا ہوش بھی نہیں رہا تو تیرے اندر اربوں کھربوں ذرات کو فیڈ کرنے والی انرجی چند سنہری ذارت میں خرچ ہو گئی ہے۔ جب کہ تیری زندگی چند مخصوص ذرات پر قائم نہیں۔ زمین کے اوپر زمین کے اندر اور فضا بکھرے ہوئے تیرتے ہوئے سنکھوں ذرات پر قائم ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام عازم سفر ہوئے تو ایک یہودی بھی ساتھ لگ گیا۔ درخواست کی کہ میں سفر میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ چلتے چلتے جب سورج کی تپش اور دھوپ کی تمازت بڑھی تو دونوں نے ایک درخت کے نیچے آرام کیا۔ کھانے کے لئے دونوں نے اپنے اپنے دستر خوان کھولے۔ یہودی نے یہ دیکھ کر کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس دو روٹیاں ہیں اور یہودی کے پاس تین روٹیاں ہیں۔ اس نے دستر خوان سمیٹ لیا اور کہا کہ میں آپ سے عمر میں بڑا ہوں۔ زیادہ تھک گیا ہوں، کھانا کھانے کے لئے ساتھ پانی نہیں ہے اس لئے مہربانی فرما کر آپ پانی لے آئیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پانی لینے کے لئے چلے گئے۔ یہودی نے جلدی سے ایک روٹی کھا لی۔ دوبارہ جب کھانے کے لئے بیٹھے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیرے دستر خوان میں تین روٹیاں تھیں۔ یہودی نے کہا آپ کو شک گزرا ہے، روٹیاں دو تھیں۔ حضرت عیسیٰ خاموش ہو گئے۔ یہودی کھانا کھانے کے بعد لیٹا تو اس کی آنکھ لگ گئی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مٹی کی تین ڈھیریاں بنائیں اور پھونک ماردی۔ وہ تینوں ڈھیریاں سونے کے ذرات میں تبدیل ہو گئیں۔ یہودی اٹھا تو سونے کی تین ڈھیریاں دیکھ کر حیران رہ گیا، پوچھا یہ سونا کس کا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ایک ڈھیری تیری ہے، ایک میری ہے اور تیسری اس کی ہے جس نے تیسری روٹی کھائی ہے۔ یہودی فوراً بول پڑا وہ روٹی میں نے کھائی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ روٹی تو نے کھائی ہے تو یہ تیسری ڈھیری تیری

ہے۔

یہودی سونے کی دو ڈھیریوں کا مالک بن کر بہت خوش ہوا اور اس نے نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ کہا، آپ اللہ کے برگزیدہ بندے اور رسول ہیں۔ آپ کو سونے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تیسری ڈھیری بھی مجھے دے دیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ سفر شروع کرتے وقت ساتھ رہنے کا جو معاہدہ ہوا تھا اس کو تو منسوخ کر دے۔ یہودی نے کہا کہ میں اکیلا ہی سفر کر لوں گا آپ جا سکتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنا کمبل اٹھایا اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔

یہودی ابھی ڈھیریوں کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا کہ تین آدمی نمودار ہوئے انہوں نے جب سونے کو دیکھا تو قریب آ کر کہا یہ سونا کس کا ہے؟ یہودی نے کہا میرا ہے۔ اب تین میں سے ایک نے کہا کہ یہ سونا تیرا کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم تین آدمی ہیں، تین ڈھیریاں ہیں ہم سونے کے حق دار ہیں۔ یہودی نے بڑا واویلا مچایا، غصہ کیا اور پھر خوشامد پر اتر آیا کہ ایسا ظلم نہ کرو، تمہارا اس سونے پر کوئی حق نہیں ہے۔

طے یہ پایا کہ ایک ڈھیری یہودی کو دے دی جائے اور دو ڈھیریاں یہ تینوں تقسیم کر لیں۔ اس شرط کے ساتھ کہ یہودی بازار میں جائے اور ان تینوں کے لئے کھانا لائے۔ انہوں نے کہا کہ ہم ڈاکو ہیں شہر میں نہیں جا سکتے۔ یہ پیسے لو اور ہمارے لئے کھانا لے آؤ اور ایک ڈھیری لے کر چلتے بنو۔ یہودی پیچ و تاب کھاتے ہوئے غصے کے عالم میں بازار پہنچا، وہاں سے کھانا خریدا اور کھانے میں زہر ملا دیا تا کہ وہ تینوں ڈاکو کھانا کھا کر مر جائیں اور پورا سونا یہودی کے ہاتھ لگ جائے۔

جیسے ہی وہ کھانا لے کر آیا تینوں میں سے ایک اٹھا اور اس نے تلوار کھینچ کر سر قلم کر دیا۔ تینوں بڑے خوش ہوئے کہ حصہ برابر تقسیم ہو جائے گا۔ کھانا کھا کر یہ تینوں بھی مر گئے اور سنہری ذرات ہوا میں اڑ کر منتشر ہو گئے۔ مٹی مٹی میں مل گئی۔

یاالٰہی!

کیا گھاٹے کا سودا ہے۔

خسر الدنیا والاخرۃ

ذالک ھوالخسر ان المبین

''اے آدم کے فرزند!

حوا کی دختر!

یہ دنیا اس لئے جہنم بن گئی ہے کہ آدم کی اولاد نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم کو دنیا کے لئے بنایا گیا ہے۔ دنیا

ہمارے لئے نہیں بنائی گئی ۔

تجربات و مشاہدات ماضی حال بتاتے ہیں کہ دنیا میں کوئی بھی بچہ جب آتا ہے تو اس کے لئے وسائل پہلے سے مہیا ہوتے ہیں۔ایسا کبھی نہیں ہوا۔بچہ زمین پر آئے تو اس کے بعد اس کی ضرورت کے مطابق وسائل پیدا ہوتے ہوں۔

یہ کیسا ظلم ہے۔

ہائے!

یہ کیسی جہالت ہے کہ ہم قدرت کے بنائے ہوئے قانون کے خلاف چل کر سکون و اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

زمین ہماری طرح عقل و شعور رکھتی ہے۔زمین ہماری طرح زندہ ہے۔جس طرح ماں کے پیٹ میں مسافرت کر کے ہم یہاں آتے ہیں اسی طرح سارے وسائل جن پر ہماری زندگی کا انحصار ہے زمین کے پیٹ میں مسافرت کر کے ہمارے لئے دست بستہ حاضر ہیں۔وسائل پابند ہیں کہ ہماری خدمت کریں۔ہمارے کام آئیں۔ہمیں زندگی بخشیں۔

صد افسوس!

جو چیز ہمارے لئے بنائی گئی ہے جو چیز ہمارے لئے محکوم کر دی گئی ہے۔ہم اس کے غلام بن گئے ہیں۔ہم نے اپنی ذات مٹی کے سنہرے ذرات پر قربان کر دی ہے۔

حضور قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں۔

زمین پر موجود شماریات سے زیادہ ذرات میں سب سے زیادہ بے وفا سنہرے ذرات ہیں۔پوری تاریخ میں ایک بھی ایسی مثال نہیں ہے کہ ان ذرات (Gold) نے کسی کے ساتھ وفا کی ہو۔انسان جب تک ان ذرات کو پیروں تلے رکھتا ہے یہ ذرات غلامی کرتے ہیں اور جب انسان ان ذرات کو تاج بنا کر سر پر رکھ لیتا ہے تو انتہائی حد تک بے وفائی کرتے ہیں اور انسان کو ذہنی اذیت میں مبتلا کر کے مار دیتے ہیں۔

عقیدہ

کن کا عمل شروع ہوا کائنات بن گئی۔ کائنات کے بارے میں ہمارا علم ابھی محدود ہے۔ ہم اتنا ہی جانتے ہیں کہ کائنات کے ایک طفیلی سیارہ پر آدم کا وجود ظاہر ہوا۔ یہ سیارہ پہلے سے موجود تھا اور آدم کے لئے وسائل مہیا کرنے کا ذریعہ تھا............ کہا جاتا ہے کہ اس سیاہ پر جنات کی نوع پہلے سے موجود تھی۔ موالیدِ ثلاثہ موجود تھے لیکن ان کی زندگی عناصر کی محتاج تھی اور عناصر اپنی زندگی کی بقاء کے لئے وسائل کے ذی احتیاج تھے۔

آدم کے پیدائش کے بعد حوا (جو خود آدم کے اندر کا رخ ہے) سامنے آئی۔ آدم و حوا سے نسل در نسل لوگ اس طرح پیدا ہوتے رہے جیسے آدم سے پہلے اس طفیلی سیارہ پر جنات نسل در نسل پیدا ہو رہے تھے۔ جب آدم زاد انفرادی شعور سے نکل کر اجتماعی شعور میں داخل ہوا تو ذہن جو محدود سوچ رکھتا تھا............ کھل گیا اور گہرائی میں ایک تلاطم برپا ہوگیا۔ دماغ میں ایک گونج ہوئی۔ اس گونج کے ارتعاش نے خیالات کو جنم دیا اور خیالات اس نقطہ پر مرکوز ہو گئے کہ

کائنات کیا ہے؟

کائنات کیوں ہے؟

کائنات کیسے شروع ہوئی؟

جیسے جیسے انسانی سوچ میں ارتقاء ہوتا رہا یہ سوالات اہمیت اختیار کرتے گئے۔ ارتقائی عمل سے گزرنے والے شعور نے............

زمین کی پستی میں جب اپنے اوپر آسمان کو چھت دیکھا تو اسے چاند، سورج، ستارے نظر آئے۔ چاند سورج ستاروں کا گھٹنا بڑھنا ڈوبنا طلوع ہونا شعور کے لئے مزید سوالیہ نشان بن گئے۔ آدم زاد نے سوچنا شروع کردیا کہ گھٹنے بڑھنے پیدا ہونے نشو و نما پانے اور فنا ہونے کا نام کائنات ہے۔ اس نے یہ راز جان لیا کہ کائنات مسلسل حرکت ہے۔ ایسی حرکت جو ہر آن ظاہر ہوتی ہے اور دوسری آن آنے سے پہلے مخفی ہو جاتی ہے۔

چاند سورج اور ستاروں کی گردش سے انسان نے یہ سمجھ لیا کہ............ سیارے اور ستارے کائنات کی بساط ہیں۔ اسی مفروضہ کو بنیاد بنا کر ستاروں کے جھرمٹوں اور کہکشاؤں کے پھیلاؤ کی مناسبت سے، ستاروں کو شناخت کرنے کے لئے انہیں جانوروں کی شکل و صورت دے دی گئی۔ اگر ستاروں کا جھرمٹ دنبہ کی شکل میں نظر آیا تو اس کا نام مینڈھا، بیل، بچھو، سرطان، شیر وغیرہ رکھ دیا۔ جھرمٹ نے انسانی شکل اختیار کی تو اس کا نام

اسی مناسبت سے رکھ دیا۔ یہ سلسلہ دراز چلتا رہا۔ نام تو وہی ہے لیکن قیاس آرائی بڑھتی رہی۔ قیاس آرائی جب ماورائیت میں تبدیل ہوگئی تو عقیدہ بن گئی اور سورج کی پرستش ہونے لگی .... سورج کی پرستش نے غیروں کی پرستش کا دروازہ کھول دیا اور پھر لوگوں نے دیوتاؤں اور دیویوں کو پوجنا شروع کر دیا .... مذہبی دانشوروں نے اپنے لئے ایک نظریہ حیات بنا دیا کہ .... سورج ہر لحاظ سے بڑا ہے اس لئے یہی پرستش کے لائق ہے۔ اس نظریہ نے انسان کو ایک ختم نہ ہونے والے قیاسی گورکھ دھندے میں گرفتار کر لیا۔ چالاک اور ذہین لوگوں نے مذہبی لبادہ اوڑھ کر اس سے مالی فائدہ اٹھایا اور ماورائی طاقتوں کا خوف مسلط کر کے سیدھے سادھے عوام کی اس طرح بے دست و پا کر دیا کہ ان کی چودھراہٹ قائم ہوگئی۔

عوام کو بے دست و پا کرنے کے لئے ایسے ایسے قوانین وضع کئے گئے۔ جن قوانین میں دہشت کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

اس طرح دو گروہ زمین پر من مانی کرنے پر قادر ہو گئے۔ ایک گروہ نے عقیدہ کے نام پر عوام کی ناک میں نکیل ڈال دی اور دوسرے گروہ نے خود کو عوام کا خادم کہہ کر کاروبار حیات سنبھال لیا۔ پھر خادم عوام کی محنت کمائے ہوئے سرمایہ پر، قابض ہو کر خود کو شداد، نمرود اور فرعون کہلانے لگے۔ اور مذہب کے نام لیوا لوگوں کا سہارا لے کر خدا کا اعلان کر دیا۔ اب سورج کی پرستش کی جگہ انسان پرستی نے لے لی اور انسان پرستی کا عروج یہاں تک ہوا کہ شداد نے اپنے پیروکاروں کے لئے زمین پر جنت بنا دی۔

انسانی برادری کے فطین اور چالاک لوگ عوام کو نہ صرف اپنا غلام بنانے کی تدبیریں کرتے رہے بلکہ معبود بن کر اللہ کی مخلوق کو اپنی مخلوق بنانے کی سازشوں میں مصروف رہے۔ ادھر یہ سب ہوتا رہا اور دوسری طرف قدرت عوام کی نگہبانی اور تحفظ کے لئے اپنے برگزیدہ بندے بھیجتی رہی ....

تاریخ کے صفحات میں دونوں گروہوں کے درمیان پہلا معرکہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے دور میں ہوا۔ بدترین تدبیر سے انہیں منجنیق پر بٹھا کر آگ کے الاؤ میں پھینک دیا۔ لیکن شکست ان کا مقدر بن گئی۔ ان کی دہکائی ہوئی آگ گلزار بن گئی۔ دوسرا بڑا معرکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں ہوا۔ فرعون جو خدائی کا دعویدار تھا .... اس نے مذہبی پروہتوں اور جادوگروں کو میدان میں طلب کیا۔ فرعون کے پیروکاروں اور دربار میں جنت کے آرزومندوں نے اپنے علم کا جادو جگایا۔ بانس اور رسیاں پھینک دیں۔ بانس اژدھا بن گئے اور رسیاں سانپ بن گئیں۔ خدائی نمائندے موسیٰ علیہ السلام نے سانپوں سے بھری ہوئی فرعون کے دربار کی زمین پر عصا رکھا تو اس نے اژدھوں کو نگل لیا ...... فرعون کی ظلم و ستم رسیدہ قوم کی قدرت نے مدد کی اور اس طرح فرعون کی خدائی دریا برد ہوگئی ....

زمانہ بدلتا رہا۔ فراعین اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ آتے رہے ....اور موسیٰ علیہ السلام کا تشخص بھی برقرار رہا۔

آج پھر سے عقیدہ کی بنیاد پر چالاک لوگ سیدھے سادے عوام کو ایک اللہ ایک رسول ایک کتاب پر ایمان رکھنے والوں کو اپنی خواہشات پر بھینٹ چڑھا دینا چاہتے ہیں ....ارتقائی دور کے ابتدائی مرحلہ میں سورج کی پرستش سے یہ کارنامہ انجام دیا گیا تھا..........فی زمانہ یہ کام دولت پرستی سے شروع کیا گیا..........دولت پرستی کسی بھی طرح سورج پرستی سے کم نہیں..........جو کسی بھی طور پر بت پرستی سے کم نہیں ہے۔

اور جو لوگ جمع کرتے ہیں سونا چاندی
اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کردیتے
ان کے لئے عذاب الیم کی بشارت ہے۔
(القرآن)

کیا آپ کو اپنا نام معلوم ہے

یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ میرا نام کب اور کیوں رکھا گیا البتہ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ دنیا میں کوئی بھی چیز بغیر نام کے نہیں ہے اور نام دراصل کسی شئے کی شناخت کے لئے ضروری ہے۔ جس طرح دنیا میں لاکھوں کروڑوں چیزوں کے نام ہیں اور یہ نام ان چیزوں کی شناخت کراتے ہیں اسی طرح میرا نام بھی رکھا گیا۔ لاکھوں کروڑوں سال سے میں اسی نام سے جانا پہچانا جاتا ہوں۔ نام جس طرح انسانوں کی شناخت کے لئے مجبوری ہے اسی طرح پرندوں، چرندوں، درندوں، حشرات الارض اور درختوں کی شناخت کے لئے بھی مجبوری ہے۔

دیکھئے نا! ایک جگہ بادام، انار، امرود، ناشپاتی، چیکو، سنگترہ، کیلا، آم اور لیچی پڑے ہوئے ہوں اور الگ الگ نام نہ ہوں تو ہم بادام کو بادام نہیں کہہ سکتے۔

یہ حقیقت بھی سامنے ہے کہ جس طرح کبوتر کے انڈے سے کبوتر اور مرغی کے انڈے سے مرغی نکلتی ہے، بادام کے درخت پر بھی بادام لگتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ بادام کے درخت سے آدم اور آدم کے درخت پر امرود لگے ہوں۔ چوپائے اور دو پیروں پر چلنے والے افراد میں بھی نسلی سلسلہ تسلسل سے قائم ہے۔ دو پاؤں پر چلنے والے آدمی کے بچے دو ہی پیروں پر چلتے ہیں اور چار پیروں پر چلنے والے چوپائے کے بچے چار پیروں پر چلتے ہیں۔ دو پیروں پر چلنے والے آدمی کی جڑ اوپر ہوتی ہے جبکہ درختوں کی جڑیں نیچے زمین میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ درخت اور آدمی کا تجزیہ کیا جائے تو اس بات سے انکار کی مجال نہیں کہ آدمی ایک درخت کی طرح ہے۔ درخت ہی کی طرح نشوونما ہوتی ہے۔ درخت ہی کی طرح آدمی کی نسل چلتی ہے۔

میری کہانی کا آغاز یہ ہے کہ میں جنگل میں بے شمار درختوں کے ساتھ رہتا تھا۔ میں پیدا ہوا اور جوان ہوا۔ جوان ہونے کے بعد میری نسل کا سلسلہ شروع ہوا۔ آدمی کی نسل تو ایک ایک کر کے پھیلتی ہے۔ مگر میری نسل کے بیج ایک وقت میں ہزاروں کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ آدمی کے اندر ریڑھ کی ہڈی دراصل ایک تنا ہے جس پر آدمی کا سراپا قائم ہے اور درخت میں یہی ریڑھ کی ہڈی درخت کا تنا بن جاتی ہے۔ جوانی میں جب تناور ہوا تو سینکڑوں شاخوں پر لاکھوں پتے نکل آئے جیسے انسانوں کے چہرے اور جسم پر بال آجاتے ہیں اور پھر میری ان شاخوں پر پھل آ گئے، پھل لگ گئے تو چڑیوں کے لئے راشن کا بندوبست ہو گیا۔ نہیں معلوم کہاں کہاں سے پرندے آتے اور میرے دستر خوان پر سے خوب سیر ہو کر کھاتے اور اڑ جاتے۔

ایک موٹی موٹی چھوٹی سی چڑیا آئی۔ اس نے خوب سیر ہو کر کھایا اور پھر سے اڑ گئی۔ فضا میں معلق اڑتی

رہی اور ہزاروں میل دور جا کر اسے آدمی کی طرح رفع حاجت کی ضرورت پیش آئی۔ فراغت کے بعد میرا ایک بیج زمین پر گرا تو زمین نے اسے اپنی گود میں سمیٹ لیا۔ زمین کی گود میں حرارت و برودت سے میرے اندر ایک نئی زندگی دوڑ گئی اور بالکل اس طرح جس طرح آدمی ماں کے بطن سے پیدا ہوتا ہے میں نے بھی زمین کی کوکھ سے جنم لیا۔ لیکن فرق یہ تھا کہ جیسے آدمی کے بچے کو اس کی ماں سردی گرمی سے بچاؤ کے لئے کپڑے رکھتی ہے میرے پاس نہیں تھے۔ بھوک پیاس رفع کرنے کے لئے زمین کے سینے میں دودھ نہیں تھا۔ مجھے بھوک پیاس کا تقاضا پورا کرنے اور سردی گرمی سے حفاظت کے لئے خود ہی انتظام کرنا تھا۔ میں نے یہ بات جان لی تھی کہ درخت کی ماں صرف بیج پیدا کرنے تک ماں ہوتی ہے۔ پیدائش کے مراحل سے گزر کر درخت کو خود اپنے ایک پیر پر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ میں نے مردانہ وار نہیں اس لئے کہ مرد ایک عضو ضعیف ہے، درختانہ وار بارش، آندھی، طوفان کا مقابلہ کیا اور ایک درخت بن گیا۔ جس کے نیچے ایک دو دس بیس نہیں پچاس آدمی دھوپ کی تمازت سے بچنے کے لئے میرے سائے میں ٹھہرتے تھے، بیٹھتے تھے اور آرام کرتے تھے۔

میں خوش تھا کہ میں اس حیثیت میں آدمیوں سے افضل ہوں کہ کوئی درخت کسی آدمی کے سائے میں نہیں رہتا۔ میں نے ابھی جوانی کی پوری بہاریں بھی نہ دیکھی تھیں کہ ایک مکروہ شکل آدمی آیا اور بغیر کسی قصور کے پے در پے کلہاڑی کے وار کئے میں بہت چیخا، بہت شور مچایا۔

میں نے کہا:

''اے میرے دوست آدمی! میں نے آندھیوں اور طوفانوں کا مقابلہ کر کے خود کو اس قابل بنایا ہے کہ تو اور تیری اولاد، میرے سائے میں رہے اور تو میرے خون جسے تو پانی کے برابر بھی نہیں سمجھتا، سے بنے پھل کھائے اور ان کے رس سے اپنی توانائی میں اضافہ کرے۔''

لیکن اس ظالم آدمی نے میری کسی التجا پر کان نہیں دھرا، میری کوئی بات نہیں سنی۔ میرے اندر کلہاڑی سے پڑنے والے گھاؤ میں سے رسنے والے خون سے وہ اتنا بھی متاثر نہیں ہوا کہ اس کی آنکھ سے ایک ہی آنسو ڈھلک پڑتا۔ وہ دیوانہ وار میرے وجود کو تیز دھار کلہاڑی سے زخمی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ میں روتا بلکتا زمین پر گر گیا۔ آدم زاد نے اس پر بھی بس نہیں کیا میری بڑی بڑی شاخوں کو جو میرے جسم میں ہڈیوں کے قائم مقام تھیں اس بے رحم آدمی نے الگ الگ کر کے چولہے میں جھونک دیا اور مجھے خاکستر کر دیا۔

میری اولاد بھی زندہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ انسان سے انتقام نہیں لے گی اس لئے کہ انتقام جیسی بدہیئت عادت تو آدمی ہی کو زیب دیتی ہے۔

میں ایک درخت ہوں۔ میرا اصل مسکن جنگل ہے۔ جہاں درندے بھی رہتے ہیں۔ میں نے نہیں

دیکھا کہ درندے نے کسی درندے کو پھاڑ کھایا ہو، کسی درندے نے کسی درندے کو قتل کر دیا ہو۔ یہ بدنمائی آدم زاد کے ہی حصے میں آئی ہے کہ وہ اپنے بھائی آدم کو قتل کر دیتا ہے۔ جب آدم خود اپنا قاتل بن گیا تو اس سے شکوہ شکایت کوئی کیا کرے............اور کیوں کرے؟

میرا کام خدمت ہے، محبت ہے، میرے بچے درخت اسی وصف کو قائم رکھیں گے۔

اے اشرف المخلوقات آدمی!

یاد رکھ!

محبت زندگی ہے،

انتقام عقوبت ہے۔

ظلم ہلاکت ہے،

حلم عافیت ہے،

قتل پاپ اور بزدلی ہے۔

معاف کر دینا بہادری ہے۔

فقط

آدمیوں کا جاں نثار دوست

ایک درخت

عورت مرد کا لباس

کوئی نظام اس ہی وقت نظام کا درجہ پاتا ہے جب اس کی بنیادیں مستحکم ہوں اور اس نظام کو چلانے والے اس کی حفاظت میں کمربستہ رہیں۔ زمین پر آدم وحوا کے وجود کے ابتدائی مرحلہ سے لاکھوں سال بعد تک معاشرتی نظام قائم ہے۔ جیسے جیسے شعوری ارتقاء ہوتا رہا.......... معاشرے کی بنیادیں تو وہی ہیں لیکن ضرورت کے مطابق اصلاح وتجدید ہوتی رہی۔ آدمؑ وحواؑ جنت سے جب زمین پر آئے تھے اسی وقت ستر پوشی کا نظام قائم ہوگیا تھا۔ زمین پر آدمؑ وحوا کی نسل بڑھی تو زندہ رہنے کے وسائل کی پیداوار اور تقسیم کا عمل شروع ہوا۔ پھر یہ معاشرہ ایک عورت اور مرد کی حسن تدبیر سے خاندان، قبائل، قوم اور ملک کی صورت اختیار کرتا چلا گیا۔ زندہ رہنے اور حیوانات سے ممتاز ہونے کے لئے آدمؑ نے (اپنے علم سے جو اسے یوم ازل میں منتقل ہو چکا تھا) قوانین بنائے۔ ہابیل، قابیل دونوں بھائیوں میں سے ایک بھائی نے جب اپنے باپ آدمؑ کے بنائے ہوئے قانون کو ضد، ہٹ دھرمی اور اپنی انا سے توڑ ڈالا تو زمین پر پہلا قتل ہوا یعنی قانون توڑنے کا پہلا رد عمل اولاد آدمؑ کے سامنے قتل کی صورت میں ظاہر ہوا۔

آدمؑ نے اپنے پیغمبرانہ علم کی روشنی میں انسانی نسل کے لئے جو معاشرتی قوانین ترتیب دیئے وہی دین حق کی بنیاد ہے۔ اسی بنیاد پر اصلاحی کام شروع ہوا.......... مرد اور عورت دونوں کے حقوق کا تعین ہوا۔ دونوں کے حقوق وفرائض متعین کردیئے گئے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہوشیار اور خود غرض لوگوں نے اس معاشرے میں قدغن لگائی اور اصلاحی معاشرہ تخریبی معاشرہ بن گیا.......... مرد چونکہ اعصابی طور پر مضبوط تھا اس نے چالاک حکمت عملی کے تحت زور بازو ہر چیز کو اپنی ملکیت بنالیا۔ آدمؑ کے بنائے ہوئے قانون کہ

''مرد وعورت دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اور لباس ہیں اور دونوں اس طرح مساوات کے عمل میں شریک ہیں کہ

ہر کوئی اپنا فرض پورا کرے

اپنا حق حاصل کرے

کسی کے حق پر غاصبانہ قبضہ نہ کرے

اور اپنا حق نہ چھوڑے۔''

پر عمل نہیں ہوسکا۔ چونکہ معاشرہ مرد اور عورت (دو یونٹ) کے بغیر مکمل ہی نہیں سکتا۔ اس لئے مرد

نے پہلی ضرب عورت پر لگائی اور وہ یہ بھی بھول گیا کہ............

''مرد کی پیدائش اور تخلیق کے عمل میں مرد کے کردار کے مقابلے میں عورت کا کردار تین حصے زیادہ ہے۔''

جنسی غلبے نے آدم زاد کو حیوانات سے زیادہ مغلوب کر دیا۔

اور اس طرح ....

عورت کو گھریلو استعمال کی ایک چیز سمجھا جانے لگا۔ بھیڑ بکریوں کی طرح اس کی خرید و فروخت ہونے لگی۔ مرنے والے مرد کے مال کے ساتھ عورت وراثت میں تقسیم ہو جاتی تھی۔ یورپ میں عورت کی وقعت اس حد تک کم تھی کہ وہ عورت کو انسان تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے۔ ہندوستان میں بیوی کو خاوند کے ساتھ ستی کر دیا جاتا تھا۔ یعنی خاوند کے ساتھ زندہ جلا دینا عورت کا مقدر بنا دیا گیا تھا............

وہی یورپ جو عورت کو انسان کا درجہ دینے پر تیار نہیں تھا............

انقلاب فرانس کے بعد اتنا ضرور نیچے آیا کہ عورت کو مرد کی خادمہ تسلیم کر لیا گیا۔

زمانے کے نشیب و فراز کے ساتھ زمین پر فساد برپا ہوتا رہا اور آدم کا بیٹا زمین کو اجاڑنے کے منصوبے بناتا رہا............ پھر حرص و ہوس اور اقتدار کی بھٹی میں ایسے ایسے مہلک ہتھیار بنائے کہ زمین پر شگوفے کھلنے کی بجائے آگ و خون کا بازار گرم ہو گیا............ اقتدار کی خواہش نے لاکھوں مردوں کو لقمۂ اجل بنا دیا۔ مرد کم ہو گئے تو عورتوں کی کثرت سے نئے نئے مسائل سامنے آئے۔ عورتیں پاگل ہو کر سر بازار آ گئیں۔ زمین پر آدم کی نسل کم ہونے لگی تو مرد سر جوڑ کر بیٹھے اور عورت کو ایسی آزادی دی کہ معاشرہ مزید درہم برہم ہو گیا۔ غیر جانبدار سوچ بتاتی ہے کہ اس میں بھی مرد کی خود غرضی سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

سوال یہ ہے کہ سب کچھ مرد ہی کیوں کرتے ہیں۔ کیا عورت میں عقل و شعور نہیں ہے۔ کیا عورت مرد کی ماں نہیں ہے۔ کیا وہ عضو معطل ہے؟

کسی بھی زمانے میں مرد نے اپنی طاقت، مضبوط اعصاب، شیطنت اور مکر و فریب سے عورت کو اقتدار میں اپنے برابر نہیں بٹھایا۔ اب جب کہ عورت کو حقوق دینے کی باتیں ہو رہی ہیں اور مساوات کے نام پر عدم مساوات کی تحریکیں چلائی جا رہی ہیں مادی چکا چوند میں معاشرے کو تباہی کی طرف دھکیلا جا رہا ہے یہ بھی زمین پر آباد پر امن لوگوں کے خلاف ایک سازش ہے۔

عورت اور مرد معاشرے کے دو اہم رکن ہیں جس طرح مرد کے بغیر کوئی معاشرہ قائم نہیں ہو سکتا اسی طرح معاشرے کے اہم ترین رخ عورت کو اگر الگ کر دیا جائے تو سارا کائناتی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

خالق کائنات نے جو تخلیق کرنے والوں میں بہترین خالق ہے۔کائناتی معاشرے کو دو رخوں سے بنایا ہے اور بار بار پیغمبروں کے ذریعہ اس کی وضاحت کرائی ہے۔حضرت آدمؑ سے لے کر سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تک ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں نے ایک ہی بات کو دہرایا ہے کہ

عورت اور مرد دو رخوں کی تخلیق ہے۔عورت اور مرد دونوں کے اپنے اپنے فرائض ہیں جب بھی ان فرائض منصبی کو کم وقعت سمجھا جائے گا معاشرے میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہو جائے گا۔

اسلام اللہ کا قانون ہے۔اس قانون نے عورت کو مساوی حقوق دیئے ہیں۔معاشرے کی تعمیر میں عورت کا بھرپور کردار ہے..........وراثت میں اسے حصے دار بنایا ہے۔بالغ عورت کو کسی کے ساتھ نکاح پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔شوہر کے لئے عورت کے حقوق پورے کرنا اسے خوش رکھنا اور اس پر خرچ کرنا اللہ نے عبادت قرار دیا ہے۔عورت کے اوپر بھی مرد کے حقوق قائم کئے ہیں۔عورت کو معاشرے کی تعمیر میں ایک اہم کردار ادا کرنے یعنی اولاد اور نسل انسانی کی صحیح تربیت اور تعلیم کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

موجودہ سائنسی اور مادیت گزیدہ معاشرہ میں عورت کے اوپر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے دیئے ہوئے حقوق کی حفاظت کرے..........اپنی انا کو ٹٹولے اور دیکھے کہ اس کے کاندھوں کو قدرت نے کتنا طاقتور اور مضبوط بنایا ہے۔

عورت پر لازم ہے کہ وہ اپنی نسل اور اپنی اولاد..........بیٹے اور بیٹیوں کو بتائے کہ مادی اقتدار عارضی ہے۔مادی زندگی فریب کے لباس میں قید ہے..........محض مادی اقتدار قوموں کے زوال کی علامت ہے۔مادی اقتدار کے پجاری اخلاقی قدروں کو پامال کر دیتے ہیں اور زمین آگ کا دریا بن جاتی ہے۔اور اس آگ میں مرد اور عورت دونوں جل کر بھسم ہو جاتے ہیں۔

اے عورت! تو میری ماں ہے۔

تو نے مجھے جنم دیا ہے۔عدم سے وجود میں لانے کیلئے تو میرے لئے وسیلہ اور ذریعہ بنی ہے۔

تیرے اندر کی آتما، تیری روح نے میری تخلیق کی ہے۔

اے عورت!

تو میری شناخت ہے تو نہ ہوتی تو میں بھی نہ ہوتا۔

میری رگوں میں جو خون دوڑ رہا ہے وہ تیرا ہی خون ہے۔

میری زندگی میں جو انرجی جل رہی ہے وہ تیری آغوش کے لمس کی گرمی ہے۔تو نے میرے باپ کو مضبوط اعصاب بخش کر خوبصورت پیکر بنایا۔

تو میری ایسی ماں ہے جس نے مجھے بھی باپ کے مقدس مرتبے پر فائز کر دیا۔

اے ماں! آج پھر تیری نسل کو تیری ضرورت ہے۔

تو اپنے بچوں کے دلوں میں انسانوں کی محبت بھر دے۔

ایسی تربیت دے کہ نوع انسانی میں سے نفرت و حقارت کے جذبات سرد پڑ جائیں، ختم ہو جائیں۔

اے ماں! ایسی تعلیم دے کہ تیری اولاد مادیت کے عفریت سے نجات حاصل کر کے ....

مادیت کے خالق کی گود کو اپنا مسکن بنائے۔

اے ماں! ٹھنڈے موسم میں تو سورج کی تپش ہے۔

گرم لہروں کو ٹھنڈا کرنے کے لئے تو چاند کی چاندنی ہے۔

تو دن کا اجالا ہے اور ستاروں بھری رات کی کہکشاں ہے۔

تو اولاد کا سکون ہے۔

اے ماں!

تجھے تیری ممتا کا واسطہ

تو اپنی روحانی قوتوں سے ہمارا سکون لوٹا دے ....

روشنی قید نہیں ہوتی

اس دنیا میں ہر آدمی ایک ریکارڈ ہے اور اس کی ساری زندگی فلم ہے۔ گھما پھرا کر بات کی جائے تو کہا جائے گا کہ عالم ناسوت کا ہر باسی ایک ڈرامہ ہے۔ ایک کہانی ہے۔ کہانی مختصر ڈرامہ ہے.........اور ڈرامہ زندگی میں کام آنے والے کرداروں کو ایک جگہ جمع کر دیتا ہے۔ ایسے کردار جو کسی ایک شخص کی انفرادی زندگی کو بھی نمایاں کرتے ہوں اور اس کے ماحول میں جو کچھ ہے اسے بھی منظر عام پر لے آتے ہوں۔ جب ہم ڈرامہ لکھتے ہیں ہمارے سامنے زندگی میں بسنے والے سارے کردار ہوتے ہیں۔ اور جب ہم ڈرامہ دیکھتے ہیں تو ہم خود زندگی کے ان کرداروں میں کھو جاتے ہیں جن سے ہم گزر چکے ہیں یا گزر رہے ہیں۔ عجیب کھیل تماشہ ہے۔ عمر رفتہ کے کسی بھی دور میں جب کوئی جھانکتا ہے تو ہر شخص کی کہانی ایک جیسی نظر آتی ہے۔ ہر آدمی مادی وجود میں اس زمین پر قدم رکھتا ہے اور ہر شخص دھیرے دھیرے، لحہ بہ لحہ مادی وجود سے دور ہوتا رہتا ہے۔ مادی وجود سے دوری اپنی جگہ مسلم۔ لیکن.............

مادی وجود جس بساط پر نمودار ہوتا ہے۔ جس بساط پر آگے بڑھتا ہے اور جس بساط پر منظر سے غائب ہو جاتا ہے وہ سب کیلئے ایک ہے۔

ابھی تک سائنسی دنیا میں کوئی ایسا علم مظہر نہیں بنا جو اس بات کی تشریح کر دے کہ بساط کیا ہے۔

کوشش لوگوں نے بہت کی کہ بساط پر سے پردہ اٹھ جائے مگر پردہ تو جب اٹھے گا جب کہیں پردہ ہو گا۔ اگر کہیں کسی کو پردے کے بارے میں کوئی خبر مل گئی ہے تو وہ خبر بھی خود پردہ ہے۔ نقاب رخ الٹ دیا جائے تو بڑی سے بڑی دانشورانہ بات بعد میں بات بن کر ایک نہ سلجھنے والی گتھی بن جاتی ہے۔ ایسی گتھی جو سلجھتی نہیں۔ اگر شعور، لاشعور اور ورائے شعور کو بھاری اور مشکل اصطلاحات کا سہارا لے کر کچھ عرض کیا جائے تو وہ بات بے پردہ ہو جاتی ہے۔ جس پر انسانی ارتقاء کی بنیاد رکھی ہوئی ہے۔

ارتقاء کیا ہے؟

ارتقاء یہ ہی تو ہے کہ.............

آدمی اپنی برائیوں، کمزوریوں کوتاہیوں کو چھپاتا ہے۔

اور خود کو دوسروں سے اچھا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

میں بھی کائنات کے ایک کنبے کا فرد ہوں وہ کنبہ جو زمین پر آباد ہے۔ مفت خوری جس کا طرۂ امتیاز ہے۔

پیدا کوئی کرتا ہے۔کہا جاتا ہے ماں نے پیدا کیا۔کفالت کوئی کرتا ہے کہا جاتا ہے باپ نے پرورش کی۔عقل وشعور پتہ نہیں کہاں سے ملتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ تجربوں اور مدرسوں سے شعور ملا ہے۔زمین پر دندناتا پھرتا ہے۔زمین کے بطن کو اپنے نوکیلے خنجروں سے چیرتا ہے.............اس میں دانہ ڈالتا ہے اور زمین سے خراج وصول کرتا ہے۔کبھی یہ نہیں سوچتا کہ زمین کا بھی کوئی حق ہے۔

جس نے زمین دی جس نے ایک پھوٹی کوڑی لئے بغیر پانی دیا،ضرورت سے بہت زیادہ وافر مقدار میں ہوا دی اس کا تذکرہ آ بھی جائے تو ایسا لگتا ہے کہ بے کار بات کی جارہی ہے۔بڑا ہو،چھوٹا ہو،کم عقل ہو یا دانشور،غریب ہو یا دولت کا پجاری قارون سب مفت خورے ہیں۔نہ صرف مفت خورے ہیں احسان فراموش بھی ہیں۔

یہ بات میں نے (جب کے میں بھی مفت خوروں کی فہرست میں اول نمبر پر ہوں)اس وقت جاننے کی کوشش کی تھی جب میری دادی اماں زندہ تھیں،میری دادی اماں پوپلے منہ کی نہایت حسین وجمیل خاتون تھیں۔کبھی مجھے لگتا کہ دادی اماں کا چہرہ چاند ہے اور اس چاند کی روپہلی کرنیں صحرا میں ریت کے ذرات میں چمک منتقل کر رہی ہیں۔کبھی مجھے دادی اماں گلاب کا پھول نظر آتیں۔دادی اماں کی عینک کے موٹے بھاری گلاس کے نیچے مجھے ان کی آنکھیں غزل چشم نظر آتیں۔اور جب میں دادی اماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کی آنکھوں میں اتر جانے کا سپنا دیکھتا تو دادی اماں مجھے سینے سے چمٹا کرا تنا پیار کرتیں کہ میرے اوپر خمار چھا جاتا اور میں ان کی گود میں دودھ پیتے بچے کی طرح سوجاتا۔

چھوٹا منہ،بڑی بات!

ایک دن میں نے دادی اماں سے پوچھا.........

میں کون ہوں.........میری ماں ساتھ کھڑی تھیں۔انہوں نے سنا تو لگا کہ ان کی آنکھیں پھیل گئیں اور مجھے دادی اماں کے پاس سے گھسیٹ کر اپنے وجود میں سمیٹتے ہوئے کہا.........

اے لڑکے!تو یہ کیسی باتیں کرتا ہے۔کیا تیرے اوپر کوئی.........تو نہیں ہے۔

بہو!خدا کے غضب سے ڈرو۔ایسی بات کبھی زبان سے نہیں نکالتے۔

میری ماں بولی!

تائی جی۔دیکھو تو سہی۔لڑکا کیا بول رہا ہے۔پوچھتا ہے میں کون ہوں.........

اس کی عمر تو دیکھو،اے اللہ تو اس کو حفظ وامان میں رکھ۔

دوسرے دن دادی اماں کے نرم وگرم۔دادی اماں کی خوشبو سے مہکتے لحاف میں پھر میں نے یہی

سوال دہرا دیا۔

دادی اماں نے مجھے ایک ایسی کہانی سنائی۔ کہانی سنتے سنتے نیند کی دیوی مجھے آسمانوں میں اڑا کر لے گئی ....

بس اتنا یاد رہ گیا۔

بیٹا! تیرا نام میں نے رکھا ہے۔ تو میرا سورج ہے۔

جیسے جیسے ماضی پردے میں غائب ہوتا رہا۔ حال سے پنجہ کشی جاری رہی۔ حال کی ہر چیز سیڑھی چڑھتے وقت دماغ کے کسی گوشے سے یہ آواز آتی۔

بیٹا تو میرا سورج ہے۔

میں سوچتا کہ..................

سورج روشنی ہے۔

سورج زندگی ہے۔

سورج ہر فرد کے لئے توانائی ہے۔

میں سورج کس طرح ہوں۔ میرا وجود تو خود توانائی کا محتاج ہے۔ میرے وجود میں اندھیرے عفریت بن گئے ہیں۔ میری زندگی اسپیس میں بند ہے۔ روشنی تو قید نہیں ہوتی روشنی کو قید نہیں کیا جا سکتا۔ افتاں و خیزاں ماہ و سال گزرتے رہے۔ بھوک اور افلاس نے منہ چڑایا تو آسمان سے نعمتوں کی بارش برسی، اپنوں نے دکھ دیئے تو غیروں نے زخموں کو مندمل کرنے کے لئے پھوئے رکھے۔

بے سروسامانی میں وحدت کا جلوہ دیکھا۔ خوشحالی میں خود کو کبر کی تصویر بنتے دیکھا۔

خاندانی وقار سے دوسرے لوگ بونے نظر آئے مگر ہر قدم پر اور ہر برائی کے وقت دادی اماں کے یہ الفاظ میرے اندر گونجتے (Echo) رہے..................

بیٹا تو میرا سورج ہے۔

یہ الفاظ کبھی مجھے برائیوں کی تمازت سے جھلس ڈالتے اور کبھی دادی اماں کی روح میرے اوپر سایہ فگن ہو جاتی۔

ایک روز جب میں دریائے ہلاکت و تاریکی میں ڈوب کر مر جانا چاہتا تھا۔ دادی اماں کی روح نے مجھے سہارا دیا اور کہا۔

بیٹا انتظار کر..............!

تیرے اوپر اللہ کی رحمت نازل ہو چکی ہے۔

انسانی شماریات سے بہت زیادہ ایک عظیم بندہ تیرے اوپر اپنی شفقتیں محیط کردے گا اور بیٹا!

تو میرا سورج ہے۔

تیری روشنی پھیلے گی۔

دادی اماں کے الفاظ

''بیٹا تو میرا سورج ہے۔''

بھول کے خانے میں جا پڑے۔لیکن دادی اماں کے یہ الفاظ عظیم بندہ بنے گا۔

میرے خون کے ساتھ میرے اندر مسلسل گونجتے رہے۔میں نے

سجدے میں گر کر اللہ کے حضور دعا کی، التجا کی:

اے اللہ! عظیم بندہ ملادے۔

اے اللہ! عظیم بندہ ملادے۔

اے اللہ! عظیم بندہ ملادے۔

اور اللہ کا وہ فرستادہ عظیم بندہ مجھے مل گیا۔

جس کا نام اسم گرامی حضرت محمد عظیم برخیا المعروف حضور قلندر بابا اولیاءؒ ہے۔

میرے اندر کی آتما کو قرار آ گیا۔تاریک زندگی روشن ہو گئی۔مجھے اجالا مل گیا۔ایسا لگا کہ یوم ازل میں اس عظیم بندہ پر میری روح قربان ہو گئی تھی۔دھیرے دھیرے میرے اندر کا سورج جو شک اور بے یقینی سے گہنا گیا تھا، افق سے باہر آیا اور اس سورج نے نیّر تاباں بننے کے لئے سفر شروع کردیا۔

حضرت محمد عظیم سے راہ و رسم بڑھی، جذبات و احساسات محبت بن گئے۔پھر محبت نے عشق کا روپ دھار لیا اور عشق مجازی سراپا عقیدت کی تصویر بن گیا۔

۱۹۵۰ء جنوری کی ایک صبح ایک دوست کی تلاش میں اخبار ڈان کے دفتر میں گیا تو وہاں ایک صاحب سے دعا سلام ہوئی۔زندگی میں پہلی مرتبہ اتنا پرسکون چہرہ دیکھ کر دل اتھل پتھل ہو گیا۔شگفتہ شاداب اور پرسکون چہرہ، آنکھوں میں کیف و مستی کا خمار، مردانہ وجاہت کی تصویر ....یقین نہیں آیا کہ اس زمانہ میں کسی بندے کو اتنا سکون میسر آسکتا ہے۔سریلی شیریں مگر مردانہ بھاری آواز میں بندہ نے کہا:

''تشریف رکھیں کیا کام ہے؟''

اور پھر گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔اس وقت بھرپور جوانی کے منہ زور گھوڑے کی رکابیں میں نے مضبوط

ہاتھوں سے تھام رکھیں تھیں .... عظیم بندہ نے میری عمر اور میرے جذبات کی مناسبت سے دو شعور سنائے۔
آنکھوں میں چمک اور خمار کے سرخ ڈورے میری آنکھوں میں دیکھ کر عظیم بندہ نے دل پر نشتر رکھ دیا۔

محبت کرتے ہو .... میں گم سم ہو گیا۔ ایک حجاب تھا جو میرے اوپر چھا گیا .... پلکیں حیا کے بوجھ سے جھک گئیں .... میرے اندر کا چور پکڑا گیا۔

محبت کرتے ہو، بے وفائی کے ساتھ

بے وفا بننا، محبت کے ساتھ اس دنیا کی

ریت ہے

میں بوجھل قدموں سے اٹھا سلام کیا۔ کہا، پان تو کھاتے جایئے۔ میں جس دوست کی تلاش میں گیا تھا وہ نہیں ملا۔ مگر مجھے مستقبل کا دوست مل گیا۔ ایسا دوست جو پہلی ہی ملاقات میں میرے دل میں اتر گیا۔

نیا نیا پاکستان بنا تھا۔ ہندوستان سے آنے والے لوگ اپنے اپنے مسائل میں گھرے ہوئے تھے۔ شہزادیاں ٹاٹ کے پردوں میں بندر روڈ کے فٹ پاتھوں پر حیات و زیست کے معاملات میں الجھی ہوئی تھیں۔ کبر و نخوت کی بڑی بڑی تصویریں آرام باغ کی پتھریلی زمین پر شب بسری پر مجبور تھیں .... جن خواتین کا کسی نے آنچل نہیں دیکھا تھا وہ حوائج ضروریہ کے لئے قطار در قطار کھڑی نظر آتی تھیں۔ جن مردوں و خواتین نے کبھی ناک پر مکھی کو نہ بیٹھنے دیا تھا .... وہ بھیک کے بڑے بڑے پیالے لے کر ناشتہ اور دوپہر کی روٹی کے لئے انتظار کرتے تھے۔ زیادہ لوگ ایسے تھے جو خورد و نوش اور رہائش کے لئے فکر مند تھے۔ ہر طرف ہر آدمی پریشانی کا پیکر تھا۔

میں بھی انہی میں سے ایک فرد تھا۔

میں نے پاکستان کی تخلیق میں کیا کچھ نہیں دیکھا ہے؟

بڑے شہر میں ایک گھر سے جب کیمپ میں جانے کے لئے باہر نکلے تو سڑکوں پر مسلمانوں کی لاشیں دیکھیں، سڑک پار کرنے کے لئے مجھے سوچنا پڑا کہ میں اپنے بھائیوں اور اپنے بچوں کی زخمی سر بریدہ لاشوں پر سے کیسے گزروں مگر جب کوئی چارہ کار نہیں رہا .... تو پنجوں کے بل گزر گیا۔

دیکھا کہ چوباروں سے خون ٹپک ٹپک کر جم گیا ہے۔ نالیوں میں پانی کے ساتھ خون بہہ رہا ہے۔ قرآن پاک کے مقدس اوراق سڑک پر بکھرے پڑے ہیں۔ میں اللہ کی کتاب کے نورانی اوراق اٹھاتے اٹھاتے اور لمبے کرتے کے دامن میں جمع کرتے کرتے شیراں والا دروازہ میں سے باہر نکل آیا۔ وہاں غیر مسلم فوجی کھڑے تھے۔ مجھے ایک فوجی نے وارننگ دی اور بندوق میری طرف تان لی۔ میں نے اس سے اس ہی کی

زبان میں کہا۔

اگر گرنتھ صاحب کے اوراق اس طرح زمین پر ہوتے تو کیا تم انہیں نہ اٹھاتے؟

فوجی بندوق پر ہاتھ مار کر اٹینشن ہو گیا اور دونوں ایڑیوں پر گھوم گیا۔

میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا اور میں سوچنے لگا مسلمان اتنا بے حس ہو گیا ہے کہ اسے یہ بھی نظر نہیں آتا کہ قرآن کی بے حرمتی ہو رہی ہے۔

جو قافلے ریلوں میں سفر کر کے آئے ہیں انہیں آج بھی یاد ہے کہ ریلوں کی چھتوں پر یخ بستہ ہواؤں میں انہوں نے سفر کیا ہے۔ جو جہاں گر گیا وہ وہاں مر گیا، بے گوروکفن لاشیں ریلوے لائن کے دونوں اطراف نظر آ رہی تھیں۔ ہماری پاک فوج ریلوں میں آنے والے قافلوں کی محافظ نہ ہوتی تو شاید وہاں سے ایک فرد بھی پاکستان زندہ نہ آتا۔

ان حالات میں کیسے کسی کے چہرے پر سکون مل سکتا ہے۔ میں ایک ٹوٹا ہوا ریزہ ریزہ بکھرا ہوا انسان تھا۔ مستقبل کی روشنی اتنی مدھم تھی کہ بے یقینی میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور اطمینان قلب لگتا تھا تقدیر سے نکل گیا ہے۔

ایسے میں ایک بندہ ملا جو پرسکون تھا، خوش تھا۔ گو کہ لباس بہت معمولی تھا، گو کہ ایک جھونپڑا تھا، گو کہ بظاہر مالی وسائل محدود تھے، مگر یہ بندہ خوش تھا۔ فکر فردا سے آزاد تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ جدوجہد جاری رہی اور اتنا زیادہ منہمک ہو گیا۔ سکون نام کی کوئی شئے قریب نہیں رہی۔ دنیاوی تگ و دو اور حرص و ہوس میں عظیم بندے کا عظیم چہرہ بھی دھندلا گیا

دادی اماں کی بات

..........بیٹا انتظار کر..........

بھی ذہن سے نکل گئی۔

جب میں دنیا میں اچھی طرح لتھڑ گیا، کثافت میرے جسم کا میل بن گئی، وسوسوں نے زندگی کو بے کیف کر دیا۔ خوف نے لقمہ تر سمجھ کر مجھے نگل لیا۔ جھوٹی انا اور پرفریب وقار کے جال میں بے دست و پا ہو گیا تو..........

میں نے خواب میں دیکھا کہ..........

ایک بزرگ مجھے شفاف چشمے کے پانی سے نہلا رہے ہیں۔ جسم میں تعفن اٹھ رہا ہے۔ ایسا تعفن جس کو سونگھ کر بار بار قے ہو رہی ہے۔

بزرگ نے مجھے نہلا دھلا کر سفید چادر میں لپیٹا اور کہا:

دادی کے پاس جانا ہے..................؟

آنکھ کھلی تو دنیا بدل چکی تھی۔کانوں میں دادی اماں کی آواز آنے لگی۔

بیٹا! تو اتنا بودا اور کمزور ہے کہ سب بھول گیا۔

تو اللہ کی دی ہوئی نعمت کو بھی بھول گیا۔

ظہر کی نماز کے وقت سے مغرب کی نماز تک مسجد میں بیٹھنا میرا معمول بن گیا۔ایک ہی بات ورد زبان تھی۔

''اے اللہ! اپنا فرستادہ عظیم بندہ ملا دے۔''

اللہ سے اپنی کوتاہی کی معافی مانگتا تھا۔آہ وزاری کرتا تھا اللہ کو پکارتا تھا۔

''اے اللہ! عظیم بندہ کہاں ڈھونڈوں؟''

تلاش میں پیر تھک گئے۔دل ڈوب گیا، آنکھیں پتھر بن گئیں۔نیند روٹھ گئی۔

بھوک و پیاس نے منہ موڑ لیا۔

یاد میں فراق میں اور فریاد میں دن رات گزرتے رہے۔

دوستوں نے کہا وظیفوں کی رجعت ہوگئی..............عاملوں کاملوں نے اشارہ کیا۔آسیب لپٹ گیا ہے..............کوئی جادو ٹونے کا چکر ہے۔جتنے منہ اتنی ہی باتیں۔میں اپنی آگ میں جلتا رہا۔قریب تھا کہ مادی وجود جل کر کوئلہ بن جائے کہ

عصر کے بعد اور غروب آفتاب سے پہلے

یہ خبر کانوں میں رس گھول گئی ....

بھائی عظیم نقاد کے دفتر میں کام کرتے ہیں۔

افتاں وخیزاں رھڑکتے دل کے ساتھ محبوب کے حضور حاضری ہوئی۔پہلی مرتبہ وصال کی لذت سے آشنا ہوا۔

اسرار و رموز سے بھرے ہوئے سینے سے مجھے چمٹا لیا۔

پیشانی پر بوسہ دیا، آنکھوں کو چوما..............عید ہوگئی۔

آندھی، برسات، گرمی، سردی روزانہ شام کے وقت دو سال تک محبوب کا دیدار ہوتا رہا اور پھر محبوب نے اپنے قدموں سے چل کر میرے گھر کو اپنے نور سے منور کر دیا۔گھر میں رونق آ گئی۔طویل عرصہ تک

شب و روز محبوب کے قدموں میں زندہ رہا۔ کوتاہ بینی سے کبھی محبوب کی نظر میں اپنائیت نہیں دیکھتا تھا تو میں موت کے گلے لگ جاتا۔

موت اور زندگی کی لڑائی میں محبوب نے کبھی موت کی فتح کو قبول نہیں کیا۔

دماغ آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ محبوب کون ہے، میں یا میری زندگی؟

عنایات خسروانہ اور لطف و کرم یہ بتاتا ہے کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ عظیم بندہ کو اپنا محبوب کہوں۔ عظیم بندہ خود ہی محبّ ہے اور خود ہی محبوب۔

میں نے اس عظیم بندے کے چودہ سال کے شب و روز دیکھے ہیں۔ ذہنی، جسمانی اور روحانی معمولات میرے سامنے ہیں۔ میں نے اس عظیم بندہ کے دل میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے۔ میں نے اس عظیم بندہ کے من مندر میں اللہ کو دیکھا ہے۔ میں نے اس عظیم بندہ کے نقطۂ وحدانی میں کائنات اور کائنات کے اندر اربوں کھربوں سنکھوں مخلوق کو ڈوریوں میں باندھے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ کائنات کی حرکت اس عظیم بندہ کی ذہنی حرکت پر قائم ہے۔ اس لئے کہ یہ اللہ کا خلیفہ ہے۔ میں نے اس بندہ کی زبان سے اللہ کو بولتے سنا ہے۔

گفتہ او گفتہ اللہ بود

گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

عظیم بندہ جسے آسمانی دنیا میں فرشتے قلندر بابا اولیاءؒ کے نام سے پکارتے ہیں، نے مجھے خود آگاہی دی ہے۔ ڈر اور خوف کی جگہ میرے دل میں اللہ کی محبت انڈیل دی ہے۔ قلندر بابا اولیاءؒ نے میری تربیت اس بنیاد پر کی ہے کہ یہاں دو طرز فکر کام کر رہی ہیں۔

ایک شیطانی طرز فکر ہے جس میں شک، وسوسہ، حسد، لالچ، نفرت، تعصب اور تفرقہ ہے۔

دوسری طرز فکر انبیاء کی طرز فکر ہے۔ جس میں محبت، اخوت، خلوص، صدق مقال، ایثار، اللہ کی مخلوق سے محبت اور خود اپنی روح سے محبت کے تقاضے ہیں۔ جو بندہ اللہ کی محبت سے آشنا ہو جاتا ہے اسے اللہ اپنا دوست بنالیتا ہے اور جو بندہ تعصب، تفرقہ اور خود نمائی کے خول میں بند رہتا ہے اسے شیطان اپنا دوست بنالیتا ہے۔